سلسلۂ مطبوعات بہادر یار جنگ اکادمی (۳)

حیاتِ بہادر یار جنگ

مؤلفہ

* غلام محمدؒ

بی۔ اے (عثمانیہ)

یکے از ناظمانِ بہادر یار جنگ اکادمی

پبلشرز:۔ بہادر یار جنگ اکادمی۔ کراچی

اشاعت سوم ________ ۲۵ جون ۶۷ء
تعداد ________ ایک ہزار
قیمت ________
مطبع ________ ایجوکیشنل پریس کراچی

*

ناشر
بہادر یار جنگ اکادمی
پی اے، ۱۴ اے سراج الدولہ روڈ۔ بہادر آباد۔ کراچی ۵

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون
	۱۔ دیباچہ طبع ثالث
۱	ـــــــ مصنّف ـــــــ
	۲۔ پیش لفظ طبع اوّل
۵	ـــــــ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی ـــــــ
	۳۔ دیباچہ طبع اوّل
۹	ـــــــ مصنّف ـــــــ
	۴۔ نعت سرورِ کائنات
۱۲	ـــــــ بہادر یار جنگ خلق ـــــــ
	۵۔ اپنی حقیقت اپنے قلم سے
۱۳	ـــــــ محمّد بہادر خاں ـــــــ
۱۷	۶۔ صبح زِندگی ـــــــ
۲۶	۷۔ مشاھدۂ آفاق ـــــــ
۳۳	۸۔ زیارت مدینۃ الرسولؐ ـــــــ
۳۵	۹۔ بلاد اسلامیہ کی سیاحت ـــــــ
	۱۰۔ نواب صاحب کے سفر بلاد اسلامیہ پر
۵۵	خواجہ حسن نظامی کا جامع تبصرہ ـــــــ
۵۷	۱۱۔ سہ سالہ تبلیغی کارنامہ ـــــــ
۷۱	۱۲۔ خاکسار تحریک

مضمون	صفحہ

***

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

دیباچہ طبع ثالث

اللہ کا شکر ہے کہ "قائدِ ملّت" جو راقم عاجز کی پہلی تالیف اور بہادر یار جنگ کی واحد سوانح حیات تھی، بہت مقبول ہوئی۔ اس کا پہلا ایڈیشن جو جنوری ۱۹۴۶ء میں نکلا چھ مہینے میں ختم ہوا! ورحسب روایتِ ناشر کتاب کی زیادہ کھپت بیرونِ حیدر آباد رہی، دوسرا ایڈیشن اپریل ۱۹۴۷ء میں نکلا اور ابھی ختم کے قریب تھا کہ سقوطِ حیدر آباد کا سانحہ پیش آیا۔ نفیس اکیڈیمی جو اس کتاب کی ناشر تھی، حیدر آباد سے کراچی منتقل ہوگئی اور اپنی مطبوعات کا جو ذخیرہ لاسکی اس میں دو سَوا دو سَو نسخے اس سوانح حیات کے بھی تھے ـــــ کراچی میں پہلا یوم بہادر یار جنگ جب منایا گیا تو نواب معین نواز جنگ نے "قائدِ ملّت" کے (۲۰۰) نسخے حیدر آباد ٹرسٹ فنڈ سے خرید کر اس موقع پر تقسیم کر دیے اور اس طرح کتاب نایاب ہوگئی۔

اَب برسوں بعد بہادر یار جنگ اکادمی، جو اس کتاب کی اشاعت کی بجا حقدار تھی، اس کا تیسرا ایڈیشن منظرِ عام پر لا رہی ہے۔ جناب محمدؐ عارف خاں صاحب ناغڑ سابق مددگار مہتمم پولیس حیدر آباد دکن نے، جن کو صاحبِ سوانح سے گہری محبّت و عقیدت ہے، کاغذ و طباعت کی اس گرانی کے دَور میں صرفِ کثیر سے کتاب کے نئے ایڈیشن کے اخراجات بلا طلب برداشت کر لئے۔ جس پر وہ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔

حیات قائد ملّت کا دوسرا ایڈیشن تو پہلی اشاعت کی ہُو بہ ہُو نقل تھا

مگر یہ تیسرا ایڈیشن صحیح معنی میں کتاب کا نقشِ ثانی ہے۔ ع

نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اوّل

اِس مرتبہ کتاب میں کافی حذف و اضافہ ہے۔ اوّلین اشاعت میں بعض باتیں جن کا تعلق نفسِ سوانح سے نہیں بلکہ واقعات سوانح کے نتائج و اسباق اور ان میں دینی ترجمانی سے تھا، کچھ زائد ہی آگئی تھیں، اس کی وجہ سے خالص مورخانہ مزاج قارئین کی نگاہ میں تالیف کا تاریخی وزن کم محسوس ہو رہا تھا، اب ان عبارتوں کو تقریباً حذف ہی کر دیا گیا ہے۔ گزشتہ برسوں میں بہادر یار جنگ مرحوم کے تعلق سے ایک اہم تاریخی دستاویز "مکاتیب بہادر یار جنگ" خود ہماری ہی اکادمی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے اور "بہادر یار جنگ کا سفر نامہ" جو خود قائدِ ملت ہی کی یادداشتوں سے ترتیب دیا گیا ہے "قائدِ ملت اکادمی" حیدر آباد دکن نے جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع کیا ہے۔ اِن دونوں کتابوں سے موجودہ ایڈیشن میں قیمتی اضافے آ گئے ہیں۔ اسی طرح پرانے مسلم لیگی رفقائے بہادر یار جنگ کے مضامین میں اگر کوئی نئی بات ملی ہے یا اپنی روایت کی تصدیق حاصل ہوئی ہے تو اس کو بھی درج کر دیا گیا ہے۔ ورنہ گزشتہ برسوں میں نواب صاحب مرحوم پر جو کچھ لکھا گیا یا بیان کیا گیا وہ بیشتر تالیف "قائدِ ملت" ہی سے ماخوذ ہے۔

یہاں ایک بات بلا تکلّف کہنے کو جی چاہتا ہے کہ اس تصنیف میں میری حیثیت بہت سی باتوں میں راویٔ اوّل کی ہے، کیونکہ میں نے ۱۹۳۹ء سے مسلسل ڈھائی تین برس تک اس عظیم المرتبت ہستی کو نہایت قریب سے دیکھا ہے اور میری عقیدت کا تعلق مرحوم کے قائدانہ اور خطیبانہ پہلو ہی سے نہیں رہا بلکہ ان کی رنگا رنگ جاذب قلب و نظر پوری کی پوری "شخصیت"

میرے دل و نگاہ کا محورِ دید رہی۔ میں نے سایہ کی طرح قریب رہ کران کو سیاسی جلسوں میں بھی دیکھا اور ادبی محفلوں میں بھی، مؤرخین کے گروہ میں بھی دیکھا اور علمائے کے زمرہ میں بھی، منبر پر بھی دیکھا اور محراب میں بھی، ان کے ظاہری ادعا کو بھی سُنا اور اُن کی حقیقی شکستگی بھی دیکھی، انھیں ہنستے کھلکھلاتے بھی دیکھا اور روتے گڑگڑاتے بھی اور اس قدر قریب آنے، دیکھنے سمجھنے کی اجازت خود اُن کے لطف و کرم نے دے رکھی تھی، اِس لئے میری روایات، مؤرخانہ معیار پر بھی، محتاجِ سند نہیں رہتیں بلکہ وہ خود سند ہیں۔

اِس کتاب میں ایک پُر اثر مضمون حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کا جو خود میری ہی فرمائش پر تحریر فرمایا گیا تھا، پہلے ہی سے بطور ضمیمہ شریک تھا، اب ایک اور مضمون "ایک بہادر مسلمان کی موت" کے زیرِ عنوان شامل ملے گا۔ جو خلد ونِ عصر علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے نواب صاحب کی جامعیت پر ایک تاریخی شہادت ہے!

میری اس تالیف پر پیش لفظ مخدومی مولانا عبد الماجد دریابادی سے اس وقت (یعنی ۱۹۴۵ء) لکھوایا گیا تھا جب وہ "مصنّف سے ذاتی طور پر "بالکل واقف نہ تھے" ——— آج مولانا اس مصنّف حقیر سے ایسے واقف ہیں کہ گویا وہ ان کے لئے کبھی اَنجانا تھا ہی نہیں، اِس لئے جی چاہتا تھا کہ اس وقت نظر ثانی شدہ کتاب پر مولانا ممدوح سے نیا پیش لفظ لکھوایا جاتا مگر پاک و ہند کے درمیان دیوارِ چین ایسی حائل ہے کہ کتاب کا جانا اور پیش لفظ کا آنا محال ہے، اِس لئے وہی پیش لفظ، جو نیا پیش لفظ آنے پر بھی بہرحال شریک رہتا، اب بھی شریک ہے۔

سوانح بہادر یار جنگ کا نام اُس وقت میں نے "قائدِ ملّت" رکھا تھا،

کیونکہ ہندوستان بھر میں نواب صاحب اسی لقب سے مشہور و معروف تھے، غالباً ۱۹۴۰ء میں مدراس مسلم لیگ نے مرحوم کو یہ خطاب پیش کیا اور وہ من جانب اللہ ہی تھا۔ کیونکہ آن کی آن میں ہمالہ سے راس کماری اور سرحد سے بنگال تک اِس خطاب نے مرحوم کے نام کی جگہ لے لی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد مسلمانانِ پاک نے جانشینِ قائدِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کو "قائدِ ملّت" کا خطاب بخشا، نواب مرحوم کی قبل پاکستان وفات، اور نواب زادہ مرحوم کی اندرونِ پاکستان اس خطاب سے شہرت کی وجہ سے ہماری نئی نسل کا ذہن "قائدِ ملّت" کے الفاظ سُنکر اس کے ملقب اوّل کے بجائے نواب زادہ مرحوم ہی کی طرف فوراً منتقل ہو جاتا ہے، اس لیے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اپنی کتاب کا نام "قائدِ ملّت" سے بدل کر "حیاتِ بہادر یار جنگ" کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اس نقشِ ثانی کو نقشِ اوّل سے زیادہ جاذبِ قلوب، اور پُر تاثیر بنائے۔

ع قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است می دانم

غلام محمد

یکے از نظمائے بہادر یار جنگ اکادمی

کراچی ۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء

پیش لفظ بر طبع اوّل

(از حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ)

دیباچہ، تعارف، پیش لفظ کی فرمائش کچھ نئی نہیں، آئے دن ہوتی ہی رہتی اور تعمیل بھی کبھی طوعاً کبھی کرہاً، کبھی "بادل خواستہ" کبھی بادل ناخواستہ، کرنی ہی پڑتی ہے۔ "حیاتِ قائدِ ملّت" کے پیش لفظ کی جب فرمائش ہوئی تو دل نے اپنے اندر کوئی امنگ اور شوق محسوس نہ کیا، بلکہ خیال یہ گزرا کہ یہ بھی انھیں رسمی فرمائشوں کی قسم کی کوئی چیز ہوگی، مگر خیر نام تو بہادر مسلمان کا درمیان میں آگیا ہے اس لیے لکھ دینا تو کچھ نہ کچھ بہر حال ہے —— مسوّدہ آیا اور اس خیال کے ماتحت فرصت کے انتظار میں کئی دن یوں ہی پڑا رہا۔ آج کھولا تو اپنی آنکھیں بھی کھلیں، بدگمانی دُور اور گرانیٔ طبع کافور ہوئی۔ خیال کو اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ شوق ونشاط کی مدد سے کتاب ایک نشست میں کہنا چاہیے کہ شروع سے آخر تک پڑھ لی گئی۔

زندے کی تصویر کھینچیے تو زندگی کا رنگ اس میں جھلکتا نظر آئیگا، زندے کا ذکر کیجیے تو دل کی دھڑکن اور سانس کی گرمی محسوس ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ بہادر یار جنگ کا افسانۂ حیات بیان ہو رہا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ اس شخصیت کی جاذبیت اور دلکشی اپنا عکس کاغذ کے صفحات پر نہ ڈال دے۔

ع جان ڈالی ہے ترے ذکر نے افسانے میں

لیکن یہ تنہا موضوع لطیف کی لطافت کی برکت نہیں، بڑا دخل اس میں فسانہ گو کے سلیقہ، اخلاص، حُسنِ ادب اور ہوشمندی کو بھی ہے۔

مصنّف سے ذاتی طور پر میں بالکل واقف نہیں[1]۔ غالباً نوعمر اور نومشق ہیں۔ لیکن کتاب کو دیکھیے تو نومشقی کی خامیوں سے یکسر خالی، پختہ کاری کے نقش و نگار سے آراستہ —— بڑے لوگوں کی زندگی برق کی تجلی ہوتی ہے کون کیمرا اس تیز چمک کو محفوظ رکھ سکتا ہے؟ دریا کی ایک لہر ہوتی ہے آئی اور گزر گئی۔ کس کا ہاتھ اسے پکڑ سکا ہے؟ مبارک ہے وہ قلم جو نقاشِ قدرت کے اِن نقوش کو کسی حد تک تحریر کے قیود و حدود کے اندر لا سکے۔ گل بی شادابی نہ سہی، رنگینی نہ سہی، نازکی نہ سہی، تازگی نہ سہی، اس کی خوشبو تو عرق گلاب میں کھینچ کر لا سکے!

"محمد بہادر خاں قدس اللہ سرّہٗ کیا تھے اور مسلم لیگ میں اِس قدر سرگرمِ عمل کیوں تھے؟ یہ عطر کشید کیا ہوا خود انھیں کے قلم سے ملاحظہ ہو:-

"میری منزل مسلمان کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاجِ نبوت پر دیکھنا ہے۔ میرا عمل، میری مجلس کی قرار دادیں اور

---

[1] اٹھائیس برس کی طویل مدت میں یہ 'ناواقفیت' کامل واقفیت سے نہ صرف بدل چکی ہے بلکہ اس میں محبّیت و محبّیت کا انشاءاللہ دائمی ربط قائم ہے؛ فالحمدللہ!

میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں مسلم لیگ کے ساتھ اس لیے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قائد اسی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ اسی مقصد کو مقصدِ حیات سمجھنے والوں کا ایک بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا ہے اور آپ حیران ہوں گے کہ یہ سب کے سب دیوانے داڑھی منڈے اور اصطلاحاً غیر عالم ہیں"۔

مرحوم بڑے فریس، بڑے ذکی، بڑے مردم شناس بھی تھے۔ سلطان ابن سعود کی حکومت، امیر امان اللہ خاں غازی، نادر شاہ، قسطنطنیہ انگورہ وغیرہ سے متعلق ان کے جو مختصر تاثرات اس حیات میں ملیں گے، وہ ان کی حکیمانہ نظر پر گواہِ ناطق اور ان کی فراست ایمانی پر شاہد صادق ہیں۔

مرحوم سے مجھے محبت اور شیفتگی تھی اور دل میں عظمت ہی نہیں عقیدت بھی تھی۔ اس پر بھی بعض قابلِ رشک باتیں اس کتاب سے پہلی بار میرے علم میں آئیں، مثلاً یہ کہ مرحوم کی براہِ راست دعوت و تبلیغ سے غیر مسلم ۵ ہزار کی تعداد میں مسلم بن چکے تھے! اور جن پر بالواسطہ ان کی دعوت و تبلیغ سے راہِ حق کھل گئی تھی، ان کا شمار تو ۲۰ ہزار تک پہنچتا ہے! اللہ اللہ! ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ مرحوم کا کوئی ایک بھی دوسرا عمل صالح نہ ہوتا، تنہا یہی ایک عمل ان کے مرتبہ کو کس بلند سے بلند مقام تک کے پہنچانے کے لئے کافی نہیں!

مرحوم کی حیاتِ نو اور مقبولیت کے سلسلہ میں جو خواب امجد حیدرآبادی کی زبان سے نقل ہوا ہے وہ بھی نہایت مؤثر ہے۔ حبیبِ خدا کی زبان سے "ہمارے حبیب" کا خطاب مجد و شرف کی انتہا ہے:۔ کوئی کن کن باتوں

پر رشک کرے، اور کہاں تک کرے!

اسلامی ہند کو دو سب سے بڑی نعمتیں دو انسانوں کے قالب میں اِس بیسویں صدی عیسوی میں عطا ہوئی تھیں۔ ایک محمد علیؒ دوسرے بہادر خاںؒ امت کے دن پھرنے کی اگر کچھ توقعات تھیں، تو انھیں دو کی ذات سے محمد علیؒ ابھی بوڑھے بھی نہیں ہوئے تھے کہ واپس بلا لئے گئے، اور ان کے حقیقی جانشین، بلکہ نقشِ ثانی، بہادر خاں تو ابھی ان سے بھی کہیں کم سن تھے! حکیم مطلق کی مصلحتیں کس بندہ کی سمجھ میں آسکتی ہیں؟ غیروں کی، منکروں کی، دشمنوں کی، باغیوں کی مسلسل اقبال مندی اور اپنے ہی محبوب کی امت کی یہ صبر آزما آزمائشیں! سچ کہا جس عارف نے بہتے ہوئے آنسوؤں اور ٹوٹے ہوئے دل وجگر کے ساتھ کہا ہے کہ:۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را رسد نہ چون وچرا در قضائے ما!

عبد الماجد

دریاباد، بارہ بنکی

۱۷۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء

دیباچہ طبع اوّل

حکیم مشرق علامہ اقبال نے بتایا تھا اور تمنّا کی تھی :-

این نکتہ کشائندہ اسرار نہانست
ملکست تنِ خاکی و دین روح روانست
تن زندہ وجاں زندہ ز ربطِ تن و جانست
با سبحہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز!
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خواب گراں خیز!

اقبال کی یہ آرزو کہاں پوری ہوئی ؟ کون دیدہ وَر اٹھا جس نے ملک کے خاکی جسم میں دین کی حیات پرور رُوح پھونکنی ناگزیر سمجھی ؟ کس کے پاس "سبحہ و سجادہ" اور "شمشیر و سناں" یکساں اہمیّت رکھتے تھے ؟ ملکوتی تخیل اور بلند جذبہ کا صحیح امتزاج کہاں دکھائی دیتا تھا ؟ کس کی نگہ بلند تھی، سخن دلنواز تھا اور جان پُر سوز تھا ؟ کس کا فقر نہ کبھی محتاج سلطان رہا نہ کسی وقت مرعوبِ سلطان ہوا ؟ مسلمانوں کی مسلسل غلامی اور مردنی میں کس نے احساسِ زیاں پیدا کر کے لہو گرمانے کی صحیح ترین کوشش کی ؟ "اشداءُ علی الکفار رحماءُ بینھم" کے جلال و جمال کا اعلیٰ امتزاج آج کی گئی گزری حالت میں بھی کس ہستی میں نمایاں تھا ؟ اور سچ پوچھیے تو کس کی زندگی خود ایک زندہ کرامت تھی ؟ —— ہندوستانی مسلمانوں کی منظم جدوجہد کی تاریخ میں ایک مولانا محمد علی جوہر کو چھوڑ کر

محمد بہادر خاںؒ (نواب بہادر یار جنگ) کے سوا اور کس کا نام لیا جا سکتا ہے؟ جو اس شانؓ کا کردار رکھتا ہو؟ بلکہ حقیقت تو یہی ہے کہ صرف بہادر یار جنگ ہی کی زندگی ایسی ہے جہاں ابتدا سے انتہا تک اس جامعیت اور صحیح اسلامی کردار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی حقیقت شناس اور حق پسند شخصیت نے مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی بس یہی کہتے سنا گیا۔

در بزمِ قدح نوشاں، در چشمِ بلا کوشاں
معشوق ترا دانم، جاناں نہ ترا یابم

ایسی جامع ہستی کی سوانح نگاری کا بیڑا اٹھانا، مجھ جیسے بے بساط کے لئے یقیناً بیجا جسارت تھی، لیکن مرحوم کی محبت اور ڈھائی سالہ قرب جس میں "درس تفسیر" اور "درس اقبال" کی خذف کو نگین بنا دینے والی صحبتیں خاص ہیں، اس جرأت کا محرک ہوا، پھر بھی شاید یہ احساس خیال کی سرحد سے نکل نہ سکتا تھا لیکن احباب کے مسلسل اصرار[ا] نے اس کو عمل کے میدان میں لاکر ہی چھوڑا، مرحوم سے وابستگی کا اظہار اس سے زیادہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ رہے نگاہ نے کسی اور کے نظارہ کو گوارا ہی نہ کیا، لیکن الحمدللہ کہ یہ چند اوراق لکھتے وقت اس کی پوری احتیاط برتی گئی کہ جذبات کا سیلاب عقل کی سرحد سے نہ گزر سکے اور عقل کی سرحد شریعت کے حصار سے بڑھنے نہ پائے اکثر واقعات کی شہادت میں خود مرحوم ہی کے الفاظ لائے گئے ہیں، خاندانی تاریخ کی حد تک "لسان الامت" والے کتابچہ پر اعتماد کیا گیا جو مرحوم کی نظروں

[ا] جن میں سب سے پیش پیش محترم پروفیسر غلام دستگیر رشید تھے جو اس وقت نظام کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے اور پھر جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ فارسی ہو گئے۔

سے گزر چکا تھا، مرحوم کی بعض اعلیٰ صفات کی تائید میں صاحب "معارف" اور صاحب "صدق" کی تحریروں کے جواہر پارے نقل کئے گئے ہیں۔

اس احتیاط کے باوجود اگر کوئی فروگزاشت ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ راقم کو معاف فرمائے ۔۔۔۔ اصل کتاب کے آخر میں ایک مختصر مضمون مرحوم کے مخدوم حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کا بھی شریک ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح علّامہ شبلی کی سوانح حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی کے قلم نے لکھی، رئیس الاحرار محمد علی جوہر کے احوال حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے نکلے، اس خداترس عاشقِ رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) مجاہدِ اسلام قائدِ ملّت کی زندگی کا نقشہ بھی کسی ایسی ہی جامع ہستی کے ہاتھوں کھینچا جاتا، لیکن ڈیڑھ سال کی طویل مدّت گزر جانے کے باوجود ہر گویا کو خاموش اور ہر رقم طراز کو ساکت دیکھ کر اگر کوئی خاموش نہ بان کہہ اٹھے اور نہ لکھ سکنے والا بھی خامہ فرسائی کی جرأت کر جائے تو تعجب نہ ہونا چاہیئے۔

حالاتِ زندگی لکھتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ موقع بہ موقع صحیح اسلامی پہلو کی وضاحت ہو جائے تاکہ "سوانح" محض واقعات کا ایک مجموعہ بن کر نہ رہ جائے بلکہ تھوڑا بہت اسلامی معلومات میں بھی اضافہ ہو سکے[۱]۔ بہرحال

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم ۔۔۔ کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد

دلریش

غلام محمد

---

[۱] یہ عبارتیں بڑی حد تک اب حذف ہی کردی گئیں تاکہ سوانح کی تاریخیت اہلِ فن کی نگاہ میں مشتبہ نہ رہے

(غ۔م)

نعتِ سرورِ کائنات (علیہ الصلوٰۃ والتحیات)

گفتۂ بہادر یار جنگ خُلق

اے کہ تیرے وجود پر خالقِ دو جہاں کو ناز
اے کہ ترا وجود ہے، وجہِ وجودِ کائنات
اے کہ ترا سرِ نیاز، حدِّ کمالِ بندگی
اے کہ ترا مقامِ عشق، قُربِ تمام عینِ ذات
اے کہ تیری زبان سے ربِّ قدیر گُل فشاں
وحیِ خدائے لم یزل، تھی تیری ایک ایک بات
اے کہ تُو فخرِ آدمی، واقفِ سِرِّ عالمی
لوح و قلم سے بے نیاز، تیرے علومِ شش جہات
تیرے عمل سے کھُل گئیں، تیرے بیاں سے حل ہوئیں
منطقیوں کی اُلجھنیں، فلسفیوں کی مشکلات
خوگرِ بندگی جو تھے، تیرے طفیل میں ہوئے
مالکِ مصر و کاشغر، وارثِ دجلہ و فرات
مجھ سے بیاں ہو کس طرح رفعتِ شانِ احمدی
تنگ میرے تصوّرات، پست مرے تخیّلات



لسان الامت قائد ملت نواب بہادر یار جنگ

اپنی حقیقت اپنے قلم سے

یہ حقائق نامہ مرحوم نے اپنے دوست مولانا محمد علی[1] پروفیسر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کے نام، لیگ کے سالانہ جلسۂ کراچی سے واپسی پر تحریر فرمایا تھا۔

---

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ

صدیق مکرم زادت الطافکم ۱۸ اپریل ۱۹۴۴ء

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ ورحمۃ اللہ

ابھی غسل خانہ سے سفر کی تکان دور کرکے نکلا تھا کہ آپ کا اخلاص نامہ ملا۔ شروع سے آخر تک اس کو نہایت غور سے پڑھا۔ گو آپ نے خود ہی آخر میں اس ارادہ کا اظہار فرمایا ہے کہ کسی دن زحمت فرمائیں گے، لیکن اس وقت ایک مختصر جواب پیش کررہا ہوں۔

آپ کے ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے میرا سطحی نہیں بہت گہری نظر سے مطالعہ فرمایا ہے۔ آپ کے خط کے جواب تین طرح کے ہوسکتے ہیں بہت مختصر اور ایک جملہ میں یہ کہ آپ کا اندازہ بالکل صحیح ہے، میں اسی طرف

---

[1] راقم کے خسر تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی سے بیعت تھے بسقوطِ حیدرآباد کے بعد سکندرآباد وحیدرآباد میں کافی مشہور رہے اور جامع مسجد سکندرآباد

جا رہا ہوں یا لیجا رہا ہوں جس طرف آپ کی توجہ ہے۔ دوسرا بہت تفصیلی جس کے لئے ملاقات ہی صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔ لیکن تیسرا بالاجمال تاکہ یہ اجمال تفصیل کی اساس بن سکے۔

پہلے اجازت دیجئے کہ خود اپنا بے لاگ جائزہ لوں جس میں نہ انکسار ہو نہ تعلیٔ شاعرانہ۔ میری قابلیت علمی چاہے علوم والسنۂ مشرقیہ سے متعلق ہو، چاہے علوم حدیثۂ مغربیہ کی نسبت، بہت سطحی اور صرف بقدرِ ضرورت ہے، انکساراً نہیں حقیقتاً گنہگار ہوں اور اس روحانی طاقت اور تقوے کی قوت سے بے بہرہ جو ایسے عزائم رکھنے والے کے لئے درکار ہے لیکن قوم کی اجتماعی فکر کو سمجھنے اور اس سے کام لینے کی بے پناہ صلاحیت قدرت نے مجھے عطا فرمائی ہے اور صرف یہی صلاحیت میری اس وقت تک کی کامیابی کا اصلی راز ہے مجھے ہر وقت اپنی بے راہ روی کا اندیشہ رہتا ہے۔ ڈرتا ہوں، دعائیں کرتا ہوں اور امرھم شوریٰ بینھم کو اپنا دنیوی سہارا سمجھتا ہوں۔ میرے بنیادی معتقدات میں سے یہ ہے کہ جس جماعت سے توصیۂ حق کی عادت جاتی رہتی ہے۔ وہ کبھی خسران سے بچ کر منزلِ فلاح تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس لئے خلوص نیت کے ساتھ جو وصیت و نصیحت کی جائے اس کو خدا کی رحمت، اور نصیحت کرنے والے کی سب سے بڑی عنایت سمجھتا ہوں۔ آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے آج کے مکتوب میں اس کی طرف توجہ فرمائی، اب سنئیے میری منزل کیا ہے؟

میں ان کے خطبات بہت انقلاب آفریں ثابت ہوئے۔ دہاں نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت کی تربیت گاہ قائم کر کے ایک مثالی جماعت تیار کر دی تھی اور بیت المال کی بنا رکھ ڈال کر مسلم بیواؤں اور ناداروں کی مالی اعانت کی مستقل سبیل جاری کر دی تھی، نومبر ۱۹۵۸ء میں رحلت کر گئے۔

میری منزل مسلمان کو منفرداً اور جماعتِ اسلامیہ کو مجتمعاً منہاجِ نبوّت پر دیکھنا ہے۔

میرا عمل، میری مجلس کی قرار دادیں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ گو ہمت عالی کے نزدیک یہ منزل بھی ایک سنگِ میل ہے اور حقیقی منزل تاج خلافت الٰہیہ کا زیب سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہو سکتا ہے، لیکن میں ان سب کو اپنے نصب العین کے لازمی نتائج تصوّر کرتا ہوں جس طرح آگ سے لازماً گرمی ملتی ہے۔ اسی طرح طریقِ مصطفوی کا سالک بے کھٹکے انتم الاعلون کا مخاطب ہو جاتا ہے، امت وسط بن جاتا ہے، خیر امت ہو جاتا ہے اور انا جعلنا کم خلائف فی الارض کا مصداق قرار پاتا ہے۔

مسلم لیگ کے ساتھ اسی لئے ہوں کہ غیر شعوری طور پر اس کا قافلہ اسی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ پاکستان کے دستور حکومت کی تحریک اس سال کے اجلاس میں نہ آسکی اور مجلسِ موضوعات نے اس کو قبل از وقت اور خلاف مصلحت قرار دیا، لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس مقصد کو مقصد حیات سمجھنے والوں کا ایک خاصہ بڑا گروہ لیگ میں پیدا ہو گیا ہے اور آپ حیران ہونگے کہ یہ سب کے سب دیوانے داڑھی منڈے اور اصطلاحاً "غیر عالم" ہیں۔ ان کی مایوسی سے دل کو رنج ہوا۔ آخری اجلاس کی آخری تقریر میری یا وہ گوئیاں تھیں۔ اس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث رہی اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اللہ نے میری زبان سے اعلان کروایا کہ پاکستان کا دستور الٰہی دستور اور وہاں کی حکومت قرآنی حکومت ہوگی اور سب سے بڑھ کر قابلِ مسرّت یہ کہ جب میں دوران تقریر اس مقام پر پہنچا تو قائدِ اعظم نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکّا مار کر فرمایا تم بالکل درست کہتے ہو، اور میں نے فوراً اعلان کر دیا

کہ قائدِ اعظم سے میرے قول پر سند تصدیق مل گئی۔

راہ کی مشکلات کا کچھ نہ پوچھئے، قائدِ اعظم کی راہ میں انگریز ہے، ہندو ہیں، اور خود ان کی جماعت کے منافقین ہیں اور میرے راستہ میں ان سب سے بڑھ کر ایک اور طاقت[1] ہے جس کو نہ توڑ سکتا ہوں نہ جس کے رہتے اپنی منزل کی طرف بڑھ سکتا ہوں، اپنی فکر کی واماندگیوں کا حال ممکن نہیں کہ زبانِ قلم سے ظاہر کر سکوں۔

کسی دن ضرور ملئے تاکہ دل کی بھڑاس نکلے، لیکن وقت کا تعین بذریعہ ٹیلیفون کر لیجئے، تاکہ میں بھی فرصت نکال سکوں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ آپ میرے لئے دعا کیجئے۔ مجھے آپ کی دعا کے مقبول ہونے کا اس لئے یقین ہے کہ اس میں اخلاص ہوگا اور وہ ہر غرض بے جا اور تقاضائے نفس سے پاک ہو گی۔

اللھم افرغ علینا صبرا وثبت اقدمنا وانصرنا علی القوم الکفرین۔

احقر العباد

محمد بہادر خاں غفرلہ

---

[1] مُراد شاہِ دکن

صُبحِ زندگی

نسب نواب بہادر یار جنگ ایک قدیم افغانی قبیلہ کے سدوزئی پٹھان تھے جنھیں عرفِ عام میں پنّی پٹھان کہا جاتا ہے۔ ان کے اجداد نے احمد شاہ ابدالی کے زمانہ میں بموجب ہر شمشیر زن قسمت آزما تھا، کچھ حوصلہ مند سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کیا۔ آپ کے جدِ اعلیٰ محمد دولت خاں اولیٰ نے قصبہ بورا باسٹ ریاست جے پور میں طرح اقامت ڈالی اور راجہ سے کچھ جاگیر پائی۔ ان کے تین لڑکے محمد نصیب خاں، محمد مانڈو رخاں اور محمد بہادر خاں اولیٰ تھے ــــــ ۱۲۳۵ھ میں اس خاندان نے جنوب کی طرف کوچ کیا، اور حیدر آباد اس وقت آئے جب مملکت آصفیہ کی باگ ڈور نواب سکندر جاہ بہادر کے ہاتھوں میں تھی۔

محمد دولت خاں اولیٰ جب دکن وارد ہوئے تو یہاں ہر طرف خلفشار اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی، ایک طرف مرہٹہ قوم کی یورشیں تھیں، دوسری طرف لٹیروں بدمعاشوں اور ٹھگوں نے عوام کی زندگی کو پُرخطر کر رکھا تھا۔ محمد دولت خاں اولیٰ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور دلیر سپاہی تھے، اپنے سپاہیانہ اوصاف کی بنا پر دربارِ شاہی میں رسائی پائی۔ نواب سکندر جاہ کی نگاہوں نے ان کی صلاحیتوں کو تاڑ لیا اور فتنہ و فساد کا قلع قمع ان کے ذمّہ قرار پایا۔ محمد دولت خاں اولیٰ اور ان کے بڑے فرزند محمد نصیب خاں اولیٰ نے بڑی فراست اور تدبر کا ثبوت دیا۔ بہت جلد بدامنی رفع ہو گئی اور مخالف عناصر اس طرح آپس میں مل گئے

گویا کوئی مخالفت تھی ہی نہیں۔ اس وقت سے ان کا شمار ریاست کے وفاداروں اور بہی خواہوں میں ہونے لگا! ور ان پر بخشش کے دروازے کھل گئے۔ صوبہ برار میں تقریباً ۴ لاکھ کی جاگیر عطا ہوئی، دو ہزار سوار، نوبت، برق انداز، ہاتھی پالکی، ڈنکہ وغیرہ جو اس زمانے کے اعلیٰ اعزاز تھے، عطا کئے گئے۔ ہفت ہزاری منصب بھی عطا ہوئی! ور آئندہ مزید فوجی اختیارات سپرد کرنیکا وعدہ کیا گیا۔

ان کے بعد محمد نصیب خاں اولیٰ نے بھی اپنا آبائی وقار اسی طرح قائم رکھا، چنانچہ مبارز الدولہ اور ناصر الدولہ کے قضیئیہ کو ختم کرنے میں اسی خاندان کا ہاتھ رہا اور اسی بنا پر محمد نصیب خاں اولیٰ نے خود نواب ناصر الدولہ کے ہاتھوں خلعت پائی، نواب کے لقب، خانی، بہادری اور عماری و نوبت وغیرہ کے اعزاز سے معزز ہوئے اور اکٹ پلی، لال گڑھی وغیرہ مواضعات بطور جاگیر پائے، نیز ایک ہزار سوار اور دو ہزار روپیہ کی منصب جلیل بھی عطا ہوئی

نواب محمد نصیب خاں (نصیب یاور جنگ اولیٰ) نے اپنے اکلوتے بھتیجے محمد دولت خاں ثانی کو چھوڑ کر ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۱ھ کو انتقال کیا۔ محمد دولت خاں نصیب یاور جنگ ثانی قرار پائے۔ ان کے جانشین ان کے فرزند محمد نصیب خاں، نصیب یاور جنگ ثالث ہوئے۔ جن کے تین فرزند محمد بہادر خاں (نواب بہادر یار جنگ مرحوم) نواب محمد ماندور خاں، اور نواب محمد دولت خاں ہیں —— اس طرح یہ پورا خاندان، جیسا کہ خود مرحوم فرمایا کرتے تھے صرف چار ناموں پر مشتمل تھا:۔ (۱) محمد دولت خاں (۲) محمد نصیب خاں (۳) محمد ماندور خاں (۴) محمد بہادر خاں۔

بہرحال پورا خاندان سرفروش اور شمشیر زن اور ہر ایک فرد سے وفاشعاری خودداری اور حمیت کے سپاہیانہ اوصاف نمایاں رہے۔

ماحول اور ولادت

حیدرآبادی جاگیردار، جن کے اجداد کی عزت ان کے معرکوں کی جبیت تھی، اب ان کی عظمت کا اظہار نوبت و نقارہ، خدمتگاروں کے غول اور خوشامدی مصاحبین کے حلقہ سے ہو رہا تھا، جن کے شاہین صفت اجداد کو میدانِ جنگ کی ہوائیں پسند تھیں، انھیں کی کرگس صفت اولاد اب پُرفضا محلوں کے قفس کی عادی ہو چلی تھی، وہاں تلوار کی کاٹ تھی، یہاں پتنگ کی کاٹ، ان کے ہاتھ تیر چھوڑتے تھے ان کے ہاتھوں کبوتر چھوٹ رہے تھے، وہاں تلوار کو صیقل کرنے اور نیزوں کی اَنی تیز کرنے سے فرصت نہ تھی، یہاں رقص و سرود سے مہلت نہیں مل پاتی تھی۔

ع شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

نتیجہ یہ ہوا کہ جن جانباز سپاہیوں کے نام سے اغیار کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، اُن کی "پدرم سلطان بود" کہنے والی اولاد کی اکڑ سے کسی کے جُوں بھی نہیں رینگتی تھی۔

نصیب یاور جنگ ثالث بھی ایک جاگیردار تھے، یہاں بھی وہی نوبت و نقارہ، وہی دنیائے دوں کی دلفریبیاں ——— مذہب کی یہاں بھی وہی رسمی حیثیت اور ہندوانہ رسوم پوری طرح سرایت کئے ہوئے۔ شعبان کا مہینہ کیا آتا تھا نصیب یاور جنگ کے ہاں "ہولی" آتی تھی سینکڑوں روپیہ آتشبازی میں راکھ کیا جاتا، روشنی ہوتی، آگ کے الاؤ دہکائے جاتے اور ان کے گرد اگرد رقص ہوتا، توہمات اور فضولیات پر یہ خرچ کسی خاص مہینے یا دن کے لئے مخصوص تو نہ تھا، لیکن خاص خاص دنوں میں رنگ رلیاں انتہا کو پہنچ جاتی تھیں یہ کوئی مبالغہ نہیں خود مرحوم کی زبانی سُنی ہوئی کہانی ہے۔

لیکن قدرت کو پھر ایک بار ظلمت میں سے نور کی جھلک دکھانی منظور

ہوئی، پھر ثابت کرنا تھا کہ مردہ زمین سے حیات پرور پودا اگانا اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں، چنانچہ ۲۷۔ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ مطابق ۳ر فروری ۱۹۰۵ء کی مبارک تاریخ تھی کہ نصیب یاور جنگ کے گھر وہ صاحب بخت پیدا ہوا، جس کو گھر والوں نے محمد بہادر خاں کے نام سے پکارا اور جو آگے چل کر بہادر یار جنگ کے شاہی خطاب اور قائدِ ملّت کے ملی لقب سے مشہور ہوا۔

مصلحین، ماحول شکن اور ماحول گر ہوتے ہیں۔ تقلید ان کا شعار نہیں بلکہ تجدید ان کا کام ہوتا ہے۔

تعلیم

محمد بہادر خاں کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ اور مفید الانام میں ہوئی پھر مدرسۂ دار العلوم بلدہ میں داخل کئے گئے۔ دورانِ تعلیم مرحوم کی حیثیت ایک اوسط طالب علم سے زیادہ کی نہ تھی، اور اس عرصہ میں ان کی کوئی ادا اس بات کا پتہ نہ دیتی تھی کہ آج کا یہ طالب علم کل کو ہندوستان کا ایک بڑا مدبر، اعلیٰ ترین خطیب اور بے مثل قائد ہوگا۔

ابھی میٹرک کا امتحان دینے نہ پائے تھے کہ والد کے انتقال کی وجہ سے جاگیر کے نظم و نسق کی ساری ذمہ داری مرحوم کے نازک کندھوں پر پڑ گئی۔ تعلیم کا تدریسی تعلق ختم ہوگیا مگر علم کا شوق اپنی جگہ قائم تھا، خانگی طور پر مولوی سعد اللہ خاں صاحب مندوزئی اور مولوی سید اشرف شمسی (صاحب "تفسیر شمسی") سے عربی ادب، تفسیر، حدیث اور فقہ کی بنیادی تعلیم حاصل کی۔ پھر آگے جو کچھ ہوئے وہ ان کی ذاتی کاوش، ذہانت، وسعتِ مطالعہ کا رہینِ منّت تھا خود فرماتے تھے کہ "میں نے فارسی کی ابتدائی کتابیں تک کسی سے سبقاً سبقاً نہیں پڑھیں، صرف عربی ہی کی تعلیم ہوئی ہے" ——— مگر ۳۵ برس کی عمر میں قرآن حکیم کے ایک غامض نظر طالب علم اور تاریخ اسلام کی انتھارٹی

بن چکے تھے، اور اردو زبان تو اُن کی تھی ہی۔ عربی، فارسی اور انگریزی پر بھی استفادۂ کتب اور اظہارِ مدعا کا پورا قابو رکھتے تھے۔

تربیت

جہاں تک تربیت کا تعلق ہے، اس کی سب سے بہترین درسگاہ ماں کی گود سمجھی جاتی ہے چنانچہ سر سیّد کا مقولہ مشہور ہے کہ ماں کی گود، دو سَو استادوں سے زیادہ موثر تربیت گاہ ہے ——

لیکن ابھی محمد بہادر خاں کو اس دنیا میں آنکھ کھولے ہوئے ہفتہ بھر بھی نہ ہوا تھا کہ ان کی والدہ چل بسیں، اور یہ اپنی نانی کے زیرِ تربیت آئے ——

مرحومہ ایک دیندار اور خدا ترس خاتون تھیں قومی معاملات سے بھی دلچسپی رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ اخبار بڑی پابندی سے پڑھا کرتی تھیں، تقریبًا چودہ برس تک قائدِ ملت مرحوم انہی کے زیرِ تربیت رہے ——

نانی نے نواسہ پر مذہبی رنگ چڑھانے کی پوری پوری کوشش فرمائی اور کامیاب رہیں، بچپن ہی سے ادائی نماز اور تلاوتِ قرآن پاک کی بہت پابندی کرائی۔ چنانچہ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جس روز صبح مَیں تلاوت نہ کرتا اُس روز وہ مجھ سے قطع کلام فرماتیں، یہ کہتے ہوئے کہ "آج تم نے اللہ سے باتیں نہیں کی ہیں میں تم سے بات نہ کروں گی" —— مرحوم جب کبھی مادی تربیت کی اہمیت کا ذِکر فرماتے تو اپنے اس واقعہ کو ضرور بیان فرماتے اور اپنی نانی مرحومہ اور ان کی تربیت کا بہت ہی احسان مندی کیساتھ تذکرہ فرماتے کہ:۔

"جو کچھ مجھ میں ہے وہ اسی چودہ سالہ کمائی کا حاصل ہے"

فنونِ سپہ گری

درسی تعلیم سے ہٹ کر مرحوم کو فنونِ سپہ گری سے خاص اُنس تھا اور یہ ذوق ورثہ میں اپنے اجداد سے ملا تھا۔ چنانچہ ایک مدت تک ورزش جسمانی جاری رہی، معقول معاوضہ پر

بعض مستند استادوں سے تلوار اور لٹھ چلانے میں اور بنوٹ میں مہارت حاصل کی، نشانہ بازی اور پیراکی میں تو معدودے چند افراد ہی مرحوم کی ٹکر کے ملیں گے، جدید فوجی اصول سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

نوید اقبال مندی

ابھی مرحوم کے طالب علمی ہی کا زمانہ تھا کہ ایک رات ایک عجیب خواب دیکھا ——— مرحوم نے دیکھا کہ ایک قبر کھودی گئی ہے اور اس میں خود انھیں کفنا کر لٹایا گیا ہے اور لوگوں کا ایک کثیر اژدحام ہے، صبح جب یہ خواب اپنے شفیق استاد علامہ شمسی سے ڈرتے جھجکتے بیان کیا تو علامہ نے فرمایا "پہلے مٹھائی لاؤ، پھر تعبیر سناتا ہوں۔" مرحوم کو ایک گونہ اطمینان ہوا کہ کوئی خراب بات تو نہیں، عرض کیا۔ "مٹھائی تو ابھی حاضر کئے دیتا ہوں، تعبیر سنا دیجئے۔" علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا آئندہ تمھیں مسلمانوں کی قیادت حاصل ہوگی۔

ماحول سے ٹکراؤ

اوپر ماحول کی تاریکی اور بے دینی کا ذکر ہو چکا، اندھیرے میں صرف مرحوم کی نانی کی ذات ایک چراغ تھی، اور وہ بھی چراغ سحر، لیکن چونکہ مرحومہ نے اپنے نواسہ کی مذہبی تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی ——— نہ معلوم ظاہری نگرانی کے علاوہ کتنی دعائیں بھی کی ہوں گی ——— اور خود قدرت کو چونکہ ایک مذہبی ہنما بنانا تھا اس لئے بچپن ہی سے اسلامی حمیّت اور پاس مذہب اور حفظ شریعت کا ذوق غالب رہا۔ دو واقعات سنئے جن سے ہماری بات کا ثبوت ملیگا۔

عید کا موقع ہے، نصیب یاور جنگ اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں، بچوں کا ساتھ رہنا بھی ضروری ہے، محمد بہادر خاں اِدھر والد کے اِس عمل کے خلاف عیدگاہ کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ والد کا اصرار ہوتا

ہے کہ یہیں نماز پڑھی جاتے۔ صاحب ہمّت فرزند عید گاہ کی اہمیت پر تقریر شروع کر دیتا ہے، والد منہ پھیر کر محلّہ کی مسجد کی طرف بڑھتے ہیں اور محمد بہادر خاں عید گاہ پہنچ جاتے ہیں۔

پندرہ سولہ برس کی عمر ہو چکی، مسیں بھیگ رہی ہیں، سبزہ کا آغاز ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ صرف ٹھوڑی پر کچھ بال نکل آتے ہیں، باقی چہرہ صاف ہے —— مدرسہ جاتے ہیں تو ہم سبق مذاق اُڑاتے ہیں، کوئی "بکرا" کہہ کر پکارتا ہے تو دوسرا کوئی اور پھبتی کستا ہے —— گھر آتے ہیں تو والد بزرگوار انتہائی مخالف، حکم پر حکم صادر ہو رہا ہے کہ فوراً ڈاڑھی منڈھوا دو۔ اُدھر سے جتنی شدت ہے، اِدھر سے اتنا ہی زیادہ استقامت اور استقلال کا مظاہرہ ہو رہا ہے —— والد ماجد نے جب دیکھا کہ ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہیں چلتا تو بہادر خاں کے دوسرے ہم عمر بھائیوں اور رشتہ داروں کو سکھا دیا کہ کبھی بہادر خاں کو پچھاڑ کر اس کی ڈاڑھی صاف کر دینا، ایک دفعہ جرأت کی گئی، ایک صاحب (رشتہ یاد نہیں) مرحوم کو غافل پا کر، ہاتھ میں قینچی لئے سینے پر سوار ہو گئے۔ مرحوم ویسے بھی قوی تھے، اور اب تو ایک جذبہ کار فرما تھا، ان صاحب کو اس بُری طرح دے پٹخا کہ پھر سے کسی نے اس قسم کا خیال بھی نہ کیا —— اس واقعہ کے بعد سے والد کی خفگی اور بڑھ گئی اور انھوں نے قطع کلام کر لیا، لیکن یہ دُھن کا پکّا نوجوان اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا۔ یہاں تک کہ اب گرداگرد ڈاڑھی نکل آئی اور حسن دوبالا ہو گیا۔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اب جو والد صاحب کی نظریں مجھ پر پڑتیں تو فوراً منہ پھیر لیتے، لیکن یہ روگردانی اب دوسرا ہی منشار لئے ہوئی تھی، وہ اب دوسروں سے فرماتے "کہ مجھے

بہادر خاں کی صورت اتنی اچھی معلوم ہوتی ہے کہ ڈرتا ہوں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے، اِس لئے فوراً منہ پھیر لیتا ہوں"۔

یہ دو واقعات، جو بظاہر معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن جن کی حیثیت آیندہ زندگی کی تعمیر میں بنیاد سے کم نہیں، وہ ہیں جو راقم الحروف نے خود مرحوم کی زبانی سُنے ورنہ نہ جانے اس قسم کے کتنے مجاہدے کرنے پڑے ہوں گے، ماحول کی خرابی خود اِس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آئی ہوں گی، اور مجاہدۂ نفس کے بڑے بڑے امتحان دینے پڑے ہوں گے —— آخر قدرت کو آفاق کی اصلاح کا کام لینا تھا، اِس لئے نفس کی تادیب و تزکیہ کے سامان بھی خوب کئے گئے۔

والد کی رحلت اور ذمّہ داریاں

ابھی عمر کے ۱۸ برس بھی پُورے نہ ہوئے کہ پدری شفقت سے بھی محروم ہونا پڑا، نواب نصیب یاور جنگ ثالث حرکتِ قلب کے یکایک رک جانے سے اِس دنیا سے کوچ کر گئے —— ۱۸ برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے ایسی کم عمری میں والد کی رحلت ہی کیا کچھ بلا نہ تھی، پھر جاگیر اور اس کی ذمّہ داریوں نے اور بھی پریشان کر دیا، فرزند اکبر کی حیثیت سے گھر اور جاگیر کے تمام امور کا بار یک بیک مرحوم کے کمزور کندھوں پر پڑا، بالائے ستم یہ کہ نصیب یاور جنگ تقریباً ۵ لاکھ روپیہ کا قرض بھی ترکے میں چھوڑ گئے تھے، مرحوم قائدِ ملّت فرماتے تھے کہ "جونہی والد کا انتقال ہوا، قرض دہندوں نے میرے دروازے کھٹکھٹانے شروع کئے، اور میں ان کے مطالبہ کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے مارے شرم کے گڑا جاتا تھا۔"

قائدِ ملّت کو انتظامی قابلیت میں کمال حاصل تھا، پیچیدہ سے پیچیدہ

معاملات کو اس خوبی سے سلجھا دیتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ اِس صلاحیت کے ساتھ استقلال اور جوانمردی کی صفت ایسی تھی جس کی وجہ سے ہزاروں پریشانیوں میں گھِر کر بھی پُرسکون رہتے تھے —— اِن اوصاف کے باوجود تقریباً آٹھ سال کے بعد جاگیر کے جھگڑوں سے نجات مل سکی، قرض ادا ہوا، جاگیر کے اندرونی انتظامات پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ سُدھر گئے، رعایا میں سکون اور خوشی کی لہر دوڑ گئی اور قائدِ ملّت کی مقبولیت کا سکّہ بیٹھتا گیا، یہاں تک کہ جب آخیر عمر میں جاگیر واپس کرنی پڑی تو جاگیر کے ہر مسلمان اور ہندو کو انتہائی قلق ہوا۔

لیکن توجہ طلب صرف جاگیر ہی کا انتظام نہ تھا، گھر کا ماحول بھی بہت بگڑ چکا تھا، غیر اسلامی رسوم اور کافرانہ رواج جڑ پکڑ چکے تھے، محمد بہادر خاں، جب تک والد ماجد کے تحت تھے ان پر بجز اپنے نفس کے کوئی ذمہ داری نہ تھی، لیکن اب تو کل انتظام کی باگ ڈور انھیں کے ہاتھ میں تھی، یہ قطعاً ناقابلِ برداشت تھا کہ ان کی سرپرستی میں وہی خرافات چلتی رہیں، چنانچہ خود فرماتے تھے کہ "جیسے ہی والد کا انتقال ہوا اور انتظام میرے ذمّہ ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اب اس حدیث شریف کا اطلاق مجھ پر بھی ہو رہا ہے کہ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ" (تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا) اِسی لئے میں نے یکلخت تمام جاہلانہ رسومات روک دیے"۔

انفرادی اصلاح کے بعد گھر ہی پہلی توجہ کا مستحق ہے جس شخص سے یہ چھوٹا سا ماحول، جہاں اس کا حکم چلتا ہے، سنبھل نہ سکے۔ وہ اصلاحِ ملّت کا دعویدار کیوں بنے؟

مشاہدۂ آفاق

کتابیں چاہے جتنی پڑھ لیجیے، جغرافیائی اور تاریخی معلومات چاہے جتنی بڑھا لیجیے مگر جس چیز کو "نظر" کہتے ہیں وہ دنیا کی سیاحت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، بہادر یار جنگ سے قدرت کو مسلم قیادت کا کام لینا تھا، تاریخ اسلام سے ان کو خاص شغف عطا کیا گیا اور پھر بلادِ اسلامیہ کے مطالعہ کے سامان بھی بہم پہنچائے گئے تاکہ وہ ایک صاحبِ نظر اور دیدہ ور قائد بن سکیں۔

مقاصدِ سیاحت

فلسطین کے ایک نامہ نگار کے سوال کے جواب میں بہادر یار جنگ نے اپنی سیاحت کی جو غرض و غایت بتلائی تھی وہ یہ ہے:-

"میرے اس سفر کے مختلف اغراض ہیں، ان میں سب سے مقدم قرآن شریف کی اس آیۂ کریمہ پر عمل ہے کہ قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلکم (کہہ دو کہ وہ زمین پر سیر کر کے دیکھیں کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو تم سے پہلے تھے) اس کے بعد عصرِ حاضر کی مسلم اقوام کے حالات کا عینی مشاہدہ کرنا ہے، تاکہ ان اقوام کے درمیان روابط کے قوی کرنے کے امکانات کو پیدا کیا جائے۔"[1]

---

[1] "بہادر یار جنگ کا سفر نامہ بلادِ اسلامیہ" ص ۳۱۵

عزمِ حج

اُوپر بتایا جا چکا کہ نواب صاحب کو ترکہ میں ۵ لاکھ کا قرض مِلا جس کو چکانے میں ۸ سال لگ گئے۔ اب جو نئے سال کا موازنہ بنا تو خاصی بچت نکل آئی ــــــــ فرماتے تھے کہ جب مجھے اپنی بچت کا حساب مل گیا تو میں نے اپنے منشی سے کہہ دیا کہ "اس سال ہم زیارتِ کعبہ کا شوق رکھتے ہیں" ــــــــ منشی نے عرض کیا "حضور کو برسوں بعد اب ذرا سکون مِلا ہے، اس لئے دو ایک سال بعد ارادہ فرمائیں" ــ نواب صاحب نے مسکرا کر فرمایا "کیا تم مجھے میری عمر کی گارنٹی دے سکتے ہو؟" ــــــــ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ہی کیا ہو سکتا تھا۔

غرض اوائل اپریل ۱۹۳۱ء میں اللہ کے اس بندے نے اپنے مولیٰ کے گھر کی حاضری کا عزم کر لیا۔ راقم الحروف سے نواب صاحب فرماتے تھے کہ "جب میں نے اپنے حج کے ارادہ کا رشتہ داروں میں اظہار کیا تو میری رفیقۂ حیات کے علاوہ میرے بہت سے اعزا اور اقربا نے ہمراہی کا اشتیاق ظاہر کیا۔ ایک بڑی پھوپھی نے کہا کہ بیٹا تم مجھے نہ لے جاؤ گے تو میرے لئے کونسا موقع رہ جاتا ہے، غرض جس جس نے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا، میں سب کو اثبات ہی میں جواب دیتا رہا اور الحمدللہ جس وقت ہم یہاں (حیدرآباد) سے چلے ہیں۔ صرف میرے خاندان والوں ہی تعداد اسّی کے قریب تھی"۔

حکومت حیدرآباد نے اس سال (یعنی ۱۳۴۹ھ) کے قافلۂ حج کا قافلہ سالار بہادر یار جنگ کو مقرر کیا، کیا خوش نصیب تھا وہ قافلہ جس کو ایسا سالار مل گیا۔

حجِ بیت اللہ

۱۲۔ اپریل ۱۹۳۱ء مطابق ۲۳ یا ۲۴ ذی قعدہ ۱۳۴۹ھ کو بہادر یار جنگ مغل لائن کے جہاز رضوانی

میں بمبئی سے روانہ ہوئے اور ۲۲۔ اپریل کو جدّہ پہنچے۔ اس جہاز کے مسافروں میں بنگال کے ایک ممتاز رہنما سر عبدالکریم غزنوی بھی تھے۔ جو اس زمانے میں وائسرائے ہند کی کونسل کے رکن تھے۔ اُنھوں نے حجاز میں ایک مشاورتی مجلس بنائی تھی جس میں حیدرآباد کے نمایندہ بہادر یار جنگ تھے۔ اس کمیٹی کا مقصد جہاز کے مسافروں کو ممکنہ سہولتیں بہم پہنچانا تھا۔ بہادر یار جنگ نے علاوہ عملی اعانت کے مسافروں کی دینی خدمات بھی انجام دیں کہ دورانِ سفر فضائل اور مسائلِ حج انھیں سمجھاتے رہے، ایک صبح درسِ تفسیر میں حج کی آیتیں آگئیں، ان کے ضمن میں فرمایا کہ بعض لوگ دورانِ سفر عوام کو فضائل و برکاتِ حج سنایا کرتے ہیں، سامعین میں سے ایک صاحب بولے "نواب صاحب سفرِ حج میں میں بھی آپ کے ساتھ تھا، روزانہ شام کو جہاز پر آپ کی تقریریں ہوتی تھیں"۔ نواب صاحب مسکرائے اور فرمایا "یہ ہمارے ساتھی نکل آئے۔" "جی ہاں جناب میری زبان ہمیشہ چلتی رہی ہے، روزانہ شام میں ڈک پر نکل آتا۔ سب لوگ جمع ہو جاتے اور میں فضائلِ حج بیان کیا کرتا تھا، بلاشبہ اللہ کا بڑا فضل شاملِ حال رہا کہ میں حاجیوں کی ہر اعتبار سے زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکا، مجھ پر سمندر کی ہوا کا کوئی بُرا اثر نہیں ہوا، اِس لیے بھی مجھے دوسروں کی جو بیمار ہو گئے تھے خدمت کا موقع ہاتھ آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہی مجھ پر مہربان رہے"۔

۲۲۔ اپریل کو جہاز جدّہ پہنچا، وہاں سے چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اور مسافروں کے ساتھ نواب صاحب بھی بندرگاہ پر اتر گئے اور ضروری انتظام کر کے رات ہی میں مکہ مکرّمہ پہنچ گئے۔ زاید کرایہ دے کر مکان ایسا لیا کہ حرم شریف سے قریب بھی تھا اور اس کی کھڑکی مسجد حرام کی سمت کھلتی

تھی ـــــــ راتوں رات عمرہ کیا اور جب احرام کھولا ہے تو فجر کی نماز کا وقت تھا ـــــــ تین دِن مکّہ مکرّمہ کی تجلّیات سے فیض پاتے رہے۔

۲۶- اپریل (۸ ذی الحجہ) کو منا روانہ ہوئے، یہاں حکومت حیدر آباد کی طرف سے کشادہ اور آرام دہ مکان کا انتظام تھا۔ نواب صاحب نے عصر و مغرب کی نماز مسجد حنیف میں اور عشاء کی مسجد کوثر میں ادا کی۔

۲۷- اپریل (۹ ذی الحجہ) کو منا سے عرفات چلے۔ یکایک گرد و غبار اٹھا۔ سینکڑوں اونٹوں پر احرام پہنے کارتوس بند سوار پیٹھ پر بندوق لئے بیٹھے تھے۔ انھیں میں سلطان ابن سعود بھی سادہ سا احرام باندھے ایک اُونٹ پر سوار عازم عرفات تھے۔

عصر تک عرفات میں قیام کر کے پھر مزدلفہ کے لئے چل پڑے، یہاں رات گزاری، اب یہ بھی کوئی پوچھنے اور محفوظ کرنے کی بات ہے کہ ایک شکستہ دِل بندے نے ان مقامات مبارکہ پر اپنے معبود سے کیا کیا معافی مانگی۔ اپنے لئے اور اپنے محبوب (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی ملّت کے لئے صلاح و فلاح کی کیسی کیسی التجائیں کیں ـــــــ بہر حال ۱۰ ذی الحجہ (۲۸- اپریل ۱۹۳۱ء) کی صبح کو مزدلفہ سے منا دوبارہ آگئے۔ رمی جمار کی، قربانی دی ـــــــ قربانی کے گوشت کی ناقدری دیکھ کر حکومت سعودیہ کو مشورہ دیا کہ اس کو کیمیائی طریقوں سے محفوظ کر کے اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۲۹- اپریل ۱۱- ذی الحجہ کو منا سے مکّہ طواف زیارت کے لئے چلے یہ پہلا موقع تھا کہ ایک نواب نے گدھے کی پیٹھ پر یہاں سے وہاں تک سفر کیا۔ حرم شریف پہنچے تو بڑے اطمینان سے طواف و سعی کی، اور منا لوٹ آئے

امیر امان اللہ خاں اور توحید پاشا وغیرہ سے ملاقات

سابق شاہ افغانستان امیر امان اللہ خاں، توحید پاشا (ترکی کے سابق سلطان عبدالعزیز کے پوتے) اور جمال پاشا سے ملاقات کی۔ جلاوطن توحید پاشا جو فرانس سے حج کے لئے آئے تھے، انھوں نے نواب صاحب سے اپنی بے بسی اور بے مقصد زندگی کا حسرت آمیز تذکرہ کیا تو نواب صاحب نے انھیں ہمّت دلائی کہ اپنے اجداد کی طرح عزم و ہمّت سے کام لے کر مسلمانوں کے اتحاد و ترقی کی جد و جہد میں لگ جائیں۔ جمال پاشا غازی اور انور پاشا ترکی افواج کے جنرل رہ چکے تھے اور اب ابن سعود کی فوج کے کمانڈر تھے، یہ انگریزی سے واقف تھے اِس لئے نواب صاحب سے ان کی تفصیلی گفتگو رہی۔

امیر امان اللہ خاں سے بغاوتِ افغانستان پر نواب صاحب سے تفصیلی گفتگو رہی جو شائع شدہ سفر نامہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بطور حاصل ایک بات تو یہ ہے جو خود راقم الحروف نے بھی نواب صاحب کی زبانی سُنی اور خواجہ حسن نظامی مرحوم نے بھی اپنے مختصر سفر نامہ دکن "نواب ابنِ بطوطہ" میں لکھی ہے کہ امان اللہ خاں نے جب نواب صاحب سے دریافت کیا کہ "ہندوستان کے مسلمان میری نسبت کیا کہتے ہیں" تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہوں، یہ سُن کر امیر امان اللہ خاں اور زیادہ متوجّہ ہوئے تو نواب صاحب نے فرمایا "آپ ایک ایسے بادشاہ تھے جو سڑک بنائے بغیر اُس پر نئے زمانہ کی موٹر دوڑانی چاہتے تھے اور اپنے کی جلد بازی کی وجہ سے آپ کی حکومت کی موٹر ٹوٹ گئی"

سبحان اللہ کیسی صائب رائے اور کیسی اچھی تشبیہ! بہرکیف پھر نواب صاحب نے پوچھا کہ آپ کیا اپنے ملک کو واپس جانا چاہتے ہیں؟ تو امیر نے کہا ارادہ تو نہیں مگر اب ان کی قوم یہ سمجھ رہی ہے کہ وہ ملک کے بہی خواہ، نیک نیت اور پکے" مسلمان تھے۔

۱۲۔ ذی الحجہ (۳۰۔ اپریل) کو بعد زوال رمی سے فارغ ہوکر بہادر یار جنگ مکہ مکرمہ لوٹ آئے۔ منا میں مصر، شام، ایران، انڈونیشیا اور جاوا وغیرہ کے مسلمانوں سے چونکہ خاصی ملاقات رہی اس لئے مکہ پہنچ کر دو دن تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہا۔

۱۵۔ ذی الحجہ کو نواب صاحب نے خانہ کعبہ کے اندر داخلہ کا شرف پایا۔ اسی روز شام کو مدرسۂ صولتیہ کا معائنہ فرمایا۔

سلطان ابن سعود سے ملاقات

۱۶ ذی الحجہ کو سلطان ابن سعود اور امیر فیصل سے ملاقاتیں ہیں،

عربی وقت کے مطابق ۳ بجے سرکاری موٹر کے ذریعہ نواب صاحب سلطان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ کمرہ میں داخل ہوئے تو سلطان نے سروقد استادہ ہوکر نواب صاحب کے سلام کا جواب دیا اور اپنے پاس بٹھلایا۔ نواب صاحب نے سلطان سے مختلف مسائل پر گفتگو کی اور سلطان کو صائب الرائے پایا، مگر نواب صاحب اور سلطان کی نزاکتِ فکر کا فرق پھر بھی اپنی جگہ تھا، اتحادِ ملّت کا ذکر جب چھڑا تو سلطان نے یہ خیال ظاہر کیا کہ جب تک مسلمان اختلافِ عقائد کو دُور نہ کر دیں گے، ان کا متحد ہونا محال ہے، مگر صاحبِ نظر بہادر یار جنگ نے یہ فرمایا کہ عقائد کا اختلاف دور کرنا محال ہے اِس لئے اتحاد کی بہترین صورت فی الحال یہی ہے کہ ان اختلافات کے باوجود مابہ الاشتراک

امور کی حد تک مسلمان متحد ہوجائیں اور اختلافی امور میں الجھنے سے احتراز کریں، اور ملّی اتحاد و مفاد کو بہر صورت ملحوظ رکھیں ——— سلطان نے نواب صاحب کی رائے سے اتفاق کیا۔

جب نواب صاحب سلطان سے رخصت ہونے لگے تو سلطان نے نواب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم جوشی سے کہا کہ میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوں اور ملاقات کا پھر ایک موقع ملے تو بڑی مسرت ہوگی۔

امیر فیصل سے ملاقات

سلطان سے رخصت ہوکر نواب صاحب سلطان کے فرزند اور نائب السلطنت شہزادہ فیصل سے ملنے گئے جو شریف حسین سابق شریف مکّہ کے مکان میں مقیم تھے۔ شہزادہ کی توجہ نواب صاحب نے تعلیم، تجارت اور زراعت میں ترقی و اصلاح کی طرف مبذول کرائی اور چند صنعتوں کی اہمیت پر خصوصی زور دیا، سعودی سکّہ کے سلسلہ میں بھی کچھ تجاویز پیش کیں، جن کو فیصل نے بہت پسند کیا۔

۱۷ ذی الحجہ کو بہادر یار جنگ نے جنت المعلیٰ کی زیارت کا شرف پایا، اور واپسی میں مولد نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام) اور خلیفہ اول کے گھر کی زیارت کی،

اسی تاریخ کو قبل عصر طواف وداع کیا۔

زیارت مدینۃ الرّسولؐ

۱۷ ذی الحجہ ہی کو نماز مغرب سے فارغ ہوکر مکہ مکرّمہ سے شہر مدینہ کے لئے چل پڑے جو اُن کے عشق کا سب سے قوی مرکز جاذبہ اور عقیدت کا نقطۂ ماسکہ

تھا، پہلے جدّہ پہنچ کر رات گزاری اور دوسرے دن کی عصر تک وہیں رہے، عصر پڑھ کر ایک موٹر کرایہ پر لی اور اب دیارِ حبیب کا سفر شروع ہوا۔ دورانِ راہ دو۲ منظر دیکھ کر نواب صاحب کی طبیعت پر بڑا اثر ہوا، ایک تو چلچلاتی دھوپ میں پیادہ پا سفر کرنے والے عاشقانِ رسُولؐ کی عزیمت و ہمّت اور دوسرے فلاکت زدہ عربوں کی یہ حالت کہ جہاں موٹر رُکی اور عرب مرد، عورتیں اور بچے بوڑھوں نے اُس کو آگھیرا اور دستِ سوال دراز کر کے یا سید الحاج حج مبرور، زیارت مقبول کی صدائیں لگانی شروع کر دیں —— بیرِ ابن حسان میں تو یہ ہوا کہ نواب صاحب نے کھانا کھایا جونہی دسترخوان جھاڑا گیا، بدوی لڑکیاں زمین پر گرے ہوئے چاول کے دانے چُن چُن کر کھانے لگیں، نواب صاحب سے دیکھا نہ گیا اور توشہ میں جو کچھ تھا وہ اُن میں تقسیم کروا دیا۔

موٹر مدینہ طیّبہ کے قریب آگئی، نواب صاحب کی نظر مسجد نبوی کے میناروں اور گنبد خضرا پر پڑی تو آنکھوں سے بے اختیار سیلِ اشک رواں ہو گیا اور زبان سے بے ساختہ السّلام علیک یا رسول اللہ کے نعرے نکلنے لگے۔

دیارِ حبیب میں پہنچ کر اور اسباب سفر قیام گاہ پر رکھ کر عاشق نبوی سرورِ کائنات رحمتِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دربارِ مقدّس میں حاضر ہو گیا سلام کا ہدیہ پیش کیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ "ایک بھٹکے ہوئے غلام کو اپنے آقا کے آستانہ کی حاضری نصیب ہو گئی۔" یہ ۲۰ ذی الحجہ کی مبارک تاریخ تھی۔

بہادر یار جنگ کا زیادہ وقت تو حرمِ نبوی ہی کی حاضر باشی میں گزرا مگر ایک مبصر سیّاح کو سب ہی کچھ دیکھنا تھا اور دیکھا۔ ۲۱ ذی الحجہ کو مساجد ابوبکر و عمر و علی (رضی اللہ عنہم) دیکھیں، ۲۲ ذی الحجہ کو اشراق کے بعد

بارگاہِ نبویؐ سے اُٹھ کر جنت البقیع کی زیارت کی، مزارات کی شکستہ حالی سے بہت دلگیر ہوئے، اسی روز شام کو نہر زرقا اور اطراف مدینہ کے باغات کی سیر کی۔

اس کے بعد دو دن بخار میں مبتلا رہے اس لئے حرمِ نبویؐ کے سوا اور کہیں نہیں گئے، جاننے والوں کا کہنا ہے کہ مدینۃ الرسول میں بخار کا آجانا ایک دولت ہے، اِس سے قلب کی جلا اور روح کی صفائی بہت بڑھ جاتی ہے، عاشقِ نبویؐ پر یہ کرم ارزانی بھی ہوئی۔

زائرین کے ہجوم کی وجہ سے شہر مدینہ میں موٹروں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اِس لئے امیرِ مدینہ سے اس کی خصوصی اجازت لے کر موٹر اندر لائی گئی، اور سہ پہر کے بعد بہادر یار جنگ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار اقدس کی زیارت کی، جبل احد کے نظارہ سے نگاہ و قلب کا سرور پایا۔ وہ جبلِ احد جس کو سرورِ کائنات سے محبت تھی اور سرورِ کائنات کو اس سے محبّت تھی — یہاں سے مسجد قبلتین آئے اور وہاں سے مسجد قبا جا پہنچے،

۲۵ ذی الحجہ کو مولانا عبدالباقی فرنگی محلی مہاجر مدنی سے ملنے گئے جو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے استاد بھی تھے اور قرابت دار بھی تھے اور چالیس برس سے مدینہ الرسول میں مقیم تھے، یہاں مولانا عبدالباقیؒ نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا جس کو حیدر آباد سے بھی مالی امداد ملتی تھی، جب بہادر یار جنگ پہنچے تو دیکھا کہ مولانا مسلم شریف کا درس دے رہے ہیں اور اقطاعِ عالم کے طلبہ ان کے درس میں موجود ہیں، درس کے بعد نواب صاحب کی دیر تک مولانا سے گفتگو رہی اور ان سے اہلِ مدینہ کے حالات معلوم کئے۔

اسی تاریخ کی شام کو امیرِ مدینہ سے ملاقات کی، نواب صاحب چاہتے

تھے کہ ان سے بقیع مبارک کی خستہ حالی اور بعض اور اسلامی اور دینی مسائل پر بات چیت ہوتی مگر وہاں ایک مصری اور ایک ہندوستانی عالم کا مقدمہ اس وقت پیش تھا، امیر نے ان میں نہایت معقول فیصلہ کیا مگر ہندوستانی مولوی صاحب نے جو اہل حدیث مسلک کے تھے، امیر کے ساتھ بھی غلط رویہ اختیار کیا جس سے امیر کی طبیعت مکدّر ہو گئی اور اس وقت نواب صاحب نے گفتگو مناسب نہیں سمجھی۔

۲۸ ذی الحجہ کو حیدرآبادی نواب نے جو مدینۃ الرسول میں فقیر بن کر آیا تھا، بعد نماز عصر بارگاہِ رسالت میں سلام وداع جس دل شکستگی سے بھی ہو، عرض کیا اور جدّہ روانہ ہو گیا، ع

جو مزہ آنے میں ہے کیونکر کہوں جانے میں ہے

راستہ میں ریت کے زبردست طوفان کی وجہ سے رابغ تک بڑی مشکل سے پہنچ سکے اور یہاں ٹھیر کر پھر جدّہ روانہ ہوئے اور ۳۰ ذی الحجہ کو جدّہ پہنچے۔ یہاں دو دن رُکنا پڑا۔ اس کے بعد "بلاقی" نامی جہاز سے نواب صاحب بیروت روانہ ہوئے۔

اب بلادِ اسلامیہ کا سفر شروع ہے، جس کا اختصار کے ساتھ یہاں ذکر کیا جاتا ہے، تفصیل کے لئے اب نواب صاحب کا سفر نامہ جو شائع ہو چکا ہے، موجود ہے۔

(مرتبہ نذیرالدین احمد صاحب شائع کردہ قائد ملت اکیڈمی حیدرآباد دکن)

بلادِ اسلامیہ کی سیاحت

بیروت حج و زیارتِ نبوی سے مشرف ہو کر بہادر یار جنگ پہلے مصر جانا چاہتے تھے مگر بقول انھیں کے "میرا پروگرام جو بلدہ

(حیدر آباد) میں مرتب ہوا تھا وہ تو یہ تھا کہ حج و زیارتِ حرمین سے فارغ ہو کر مصر جاؤں گا اور وہاں سے بیت المقدس، یہی سیدھا راستہ بھی تھا، لیکن کچھ تو منظور نہ تھا اور کچھ مصریوں کی عجیب و غریب سیاست، جس کا ذکر بعد واپسی تفصیل سے کروں گا اور لکھوں گا بھی۔ غرض مصری حکومت نے ایک قانون یہ بنا رکھا ہے کہ جو شخص حج کرے وہ حجاز سے براہ راست مصر نہ آئے اور نہ حدودِ مصر میں داخل ہو۔ مجبوراً بیروت کا ٹکٹ لینا پڑا۔

"جدّہ سے روانگی کے بارھویں روز بیروت پہنچے، یہاں پر ہم کو نہلا اور ہمارے سامان کو بھپارہ دیا گیا۔ ایک روز قرنطینہ میں ٹھیرنا پڑا اور دوسرے روز آزادی نصیب ہوئی ——— دو روز بیروت کی سیر کی جو شام کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے، مغربی تمدّن سے پوری طرح بہرہ اندوز...... قدرت نے بیروت بلکہ شام کو اپنی فیاضیوں سے مناظر و سرسبزی سے مالا مال کر دیا ہے۔ نہریں بہتی ہیں، آبشار گرتے ہیں اور صنوبر سے گھری ہوئی پہاڑیوں کو دیکھ کر جسم میں خون بڑھنے لگتا ہے۔ امریکن مشن کی عظیم الشان یونیورسٹی دیکھی جو ترقی کرنے والوں کا بہترین کارنامہ اور خوابِ غفلت کے متوالوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے" [۱] (مکتوب مورخہ ۱۰ رجون ۱۹۳۱ء)

فلسطین

اپنے اسی مکتوب میں جس کا اقتباس بیروت کے ضمن میں نقل ہو چکا ہے، نواب صاحب لکھتے ہیں:-

"بیروت سے بیت المقدس چلے، صبح نکلے تھے شام کو پہنچ گئے...... مناظر قابلِ دید اور ناممکن البیان ہیں۔ انبیا کی اس سرزمین پر پہنچے آج پانچواں دن ہے، بوڑھے ابراہیمؑ کے وعظ، داؤدؑ کے نغمے، اور یعقوبؑ فرزند گم کردہ

---

[۱] سفرنامہ صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵

کی آہ وزاری کانوں میں گونجنے لگتی ہے، آسوایوں کا ظلم، مصریوں کا قتلِ عام، رومیوں کا جلال وجبروت، مسلمانوں کی رواداری اور حسنِ سلوک ہر قدم پر نظر آرہا ہے۔ سلیمانؑ کی عظمت (CITY OF DAVID ،) داؤدؑ کے شہر کے ہر پتھر سے ظاہر ہورہی ہے۔ غرض آنکھیں دیکھ رہی ہیں، کان سن رہے ہیں قلب سوچ رہا ہے اور ہاتھ لکھ رہے ہیں، ——— دو تین دن یہاں اور ہوں اور بیت المقدس کی خاک چھان رہا ہوں، حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ اور یوسفؑ کی زیارت کا شرف حاصل ہوچکا ہے، آج حضرت موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کی بارگاہ پر حاضر ہونگا اور اگر خدا نے چاہا تو دو تین روز بعد مصر کا قصد کروں گا" (صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶)

سیاسی تبصرہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے نواب صاحب سے سن کر اس کا نچوڑ یہ بیان کیا ہے :-

"اس کی (فلسطین کی) نسبت مرحوم اچھا خیال رکھتے ہیں، یہاں کے مشہور لیڈر "امین الحسینی" کے متعلق مرحوم کا خیال تھا کہ یہ ایک ایسے لیڈر ہیں جن کی تمام دنیا میں ضرورت محسوس ہورہی ہے، ان کا علم بھی صحیح احساس بھی صحیح اور عمل بھی صحیح ہے، اور ان کے اندر عوام وخواص کو کشش کرنے کی قابلیت بھی بہت زیادہ ہے، مرحوم نے مصر، شام، عراق، اور فلسطین کی عرب اقوام کو دیکھنے اور ان کے لیڈروں سے ملنے کے بعد یہ رائے قائم کی کہ اس وقت ایک عالمگیر اخوت اور عالمگیر مفاد اسلامی کو سمجھنے والا اور برتنے اور عمل کرنے کا مقصد رکھنے والا فلسطین ہی میں ایک شخص ہے اور وہ امین الحسینی ہے!

یہودی تحریک کو بھی بیت المقدس میں نہایت عمدہ بصیرت و بصارت

سے دیکھا اور ان کی نوآبادیاں بھی دیکھیں، تل ابیب، وہ آبادی جو یہودیوں نے یافہ کے قریب بنائی ہے۔ اس کو بھی دیکھا اور اس کی موزونیت اور خوشنمائی اور ان کے کتب خانہ کو بھی دیکھا، جس کو یہودی آٹھ برس سے تیار کر رہے تھے، اور اس وقت تک حرف "ج" تک پہنچے تھے۔ بحیثیت مجموعی مرحوم کا خیال تھا کہ یہودیوں کا فلسطین سے خارج کرنا اتنا آسان نہیں جتنا یہاں کے عربوں نے سمجھ رکھا ہے"۔[۱]

مصر

بیت المقدس کی زیارت سے فارغ ہو کر سہ شنبہ ۱۶ جون ۱۹۳۱ء کو بہادر یار جنگ مصر[۲] پہنچے، اپنے مکتوب مورخہ ۲۳[۳] جون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہاں کے امراء و علماء سے ملاقاتیں ہوئیں، اسمٰعیل صدیقی پاشا وزیراعظم محمد علی پاشا انیس احرار، دستوریین پاشا شیخ الازہر شیخ مصطفیٰ المراغی، ڈاکٹر منصور فہمی اور ڈاکٹر محمد حسین ہیکل یہاں کے زعما اور لیڈر ہیں، ان سے اتحاد اور رابطۂ اسلامی کے مسائل پر گفتگو ہوئی اور ہو رہی ہے۔ ان سبھوں نے میری دعوتیں کی ہیں اور کل میری طرف سے ان سب کو ایک ٹی پارٹی دی جانے والی ہے۔ اخبارات کے نمائندے آرہے ہیں، اور انٹرویو لینگے، کل الاہرام کے نمائندے نے سوالات کئے تھے، آج امریکہ کے اخبار ڈیلی ہیرالڈ کا نمائندہ آیا تھا۔ الضیاء وفد پارٹی کے سب سے بڑے اخبار نے مبالغہ آمیز مقالہ میری آمد پر لکھا ہے، علماء اتحاد دینی کے مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں اور امراء اتحاد سیاسی و معاشرتی مسئلہ میں، سیر بھی ہوئی اور ہو رہی ہے ——— اتفاق سے آجکل یہاں مصری پارلیمنٹ کے

۱؎ دکن کا ابن بطوطہ از خواجہ حسن نظامی مشمولہ سفرنامہ محولہ سابق ۲؎ ۳؎ سفرنامہ ص ص ۲۰۷ و ۲۰۸

اجلاس ہو رہے ہے۔ کل وزیر اعظم نے بطور خاص معائنہ کا کارڈ بھیجا تھا، معتمد نے استقبال کیا، مخصوص مہمانوں کے کمرے میں بٹھایا گیا، الحمد للہ، پرسوں قاہرہ سے اسکندریہ اور وہاں سے شام جاؤں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سیاسی تبصرہ

بہادر یار جنگ کا سفر نامہ جو چھپا ہے اس میں سفر مصر پر ان کا خود نوشتہ تقریباً ۴ا صفحاتی نوٹ شامل ہے، جو ان کے وسعت و عمق مشاہدہ کا آئینہ ہے۔ اس میں "موجودہ سیاسیات" کے زیر عنوان تقریباً چار صفحات کا تبصرہ ہے جس کا ایک مختصر اقتباس بطور مشتے نمونہ از خروارے درج ذیل ہے :-

"مصر اپنے دوسرے ہمسایہ ممالک کی طرح بہت اہم داخلی سیاسی دَور سے گزر رہا ہے، یہاں فی الحال پانچ سیاسی جماعتیں ہیں :-

(۱) وفدی (۲) احرار دستوری (۳) اتحادی (۴) وطنی اور (۵) شعبی، سب سے قوی اور با اثر جماعت وفدیوں کی ہے جس نے سعد زاغلول پاشا کے زیر قیادت مصر کے لئے ۱۹۲۴ء میں دستور حاصل کیا اور اب تک استقلالِ کاملہ کے دعاوی کے ساتھ بر سرِ پیکار ہے اور حزبِ الشعب سب سے آخری جماعت ہے جو صدقی پاشا نے اپنی حکومت کی تائید کے لئے حال میں ترتیب دی ہے قیام مجلس النواب کے بعد سے کچھ دنوں قبل تک ملک پر وفدی جماعت ہی کی حکومت تھی، ایک مسوّدۂ قانون پر مصطفیٰ النحاس پاشا، موجودہ رئیس جماعت وفدی نے بادشاہ سے ناراض ہو کر وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجبوراً بادشاہ کو نحاس پاشا کی پیش کردہ شرائط تسلیم کر کے وزارت اُن کے سپرد کرنی پڑے گی، مگر حزب الاحرار کے ایک سابق وزیر اسمٰعیل صدقی پاشا نے اپنی جماعت اور وفدیوں کے خلاف نہ صرف وزارت قبول کر لی،

بلکہ جبر و استبداد اور قوت کے ذریعہ اس کو ایک حد تک مستحکم بھی کر لیا، وزارت کے ہاتھ سے جانے کے باوجود مجلس النواب اور مجلس الشیوخ میں وفدیوں کی اکثریت تھی، اور وہ صدقی پاشا کی ہر تجویز کی مخالفت کر کے بلکہ کئی دفعہ اس پر بے اعتمادی کا ووٹ پاس کر کے اس کی حکومت کو کمزور کرنا چاہتے تھے اس پارلیمان کے انتخابات میں جس کے افتتاح کا ذکر اوپر ہوا صدقی پاشا نے حکومت کی پوری قوت وفدیوں کے خلاف برتی اور گو سارا ملک چیختا رہا کہ یہ ظلم ہے، جبر ہے لیکن اس نے ایک نہ مانی اور ایسا انتخاب کرایا کہ دونوں مجلسوں میں ایک بھی وفدی یا احراری نظر نہیں آتا۔ سوا الضیاء کے جس کے منہ پر بقول نحاس پاشا مہریں لگا دی گئی ہیں، وفدیوں کے تمام اخبار مسدود کر دیے گئے ہیں، وفدیوں کے کلب اور بیت الامۃ (زاغلول پاشا کا گھر) پر ہر وقت پولیس کا پہرہ لگا رہتا ہے، وفدی جیل خانوں میں جا رہے ہیں، پٹ رہے ہیں اور مر رہے ہیں مگر اپنی کوششوں میں استقلال کے ساتھ مصروف ہیں ...... اہلِ ملک نحاس پاشا سے بہت محبّت کرتے ہیں جس کے کئی والہانہ مناظر میری آنکھوں نے دیکھے ہیں۔"

مرحوم فرماتے تھے کہ نحاس پاشا اور ام المصریین تمام مصر میں مقبول ہیں۔

مصر میں نواب صاحب کی عربی دانی کا چرچا

یہ واقعہ راقم الحروف نے خود بہادر یار جنگ مرحوم کی زبانی سنا کہ جب وہ پہلی بار نحاس پاشا سے ملنے گئے اور گفتگو چند خاص اہم مسائل پر ہونے والی تھی، تو اپنے متعلق گمان یہ رہا کہ شاید ٹھیک طور پر عربی بول نہ سکیں گے اس لئے ایک قادیانی مبلّغ کو جو وہاں موجود تھے، ترجمان کی حیثیت سے ساتھ لے گئے، مرحوم فرماتے تھے کہ "چند

منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے ترجمان صاحب میری ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں کر رہے ہیں، اِس لئے میں نے اُن کو درمیان سے الگ کر دیا اور نحاس پاشا سے کہا کہ بولنا میرا کام ہے اور سمجھنا آپ کا کام، جمع کو واحد، واحد کو تثنیہ اور مذکر کو مؤنث بولوں تو معاف فرمائیے اور مفہوم سمجھ لیجیئے، اس کے بعد براہ راست گفتگو دیر تک ہوتی رہی، دوسرے دِن مجھے تعجب ہوا کہ مصر کے اچھے اچھے اخباروں میں میرا فوٹو بھی چھپا ہے اور تعارفی نوٹ بھی لکھے گئے ہیں اور عنوان ہے "حیدر آباد کا ایک نواب جو عربی فُصّاح میں گفتگو کرتا ہے" ــــــ مرحوم فرماتے تھے کہ مصر کا پریس نہایت ترقی یافتہ ہے، ہر خبر بہت جلد ملک بھر میں پھیل جاتی ہے۔

قرآن کے ترجمہ پر اعتراض کا جواب

نواب صاحب جامعۂ ازہر کے پرنسپل (شیخ الازہر) کے ہاں مدعو تھے، شیخ نے فرمایا "ہندوستانی تو قرآن مجید کا بھی ترجمہ کرتے ہیں" ــــــ حاضر جواب نواب نے فوراً فرمایا "ترجمہ نہیں ترجمانی کرتے ہیں، اور اس میں کیا قباحت ہے"؟ شیخ الازہر نے ہنستے ہوئے فرمایا "آپ نے بچا لیا" ــــــ یہ لطیفہ خود نواب صاحب کی زبانی سنا ہوا ہے، رحمتہ اللہ علیہ ؎

بعلبک اور حمص

۱۰ر جولائی ۱۹۳۱ء مطابق ۲۳ صفر ۱۳۵۰ھ) بعد مغرب بعلبک کے ارادے سے روانہ ہوا۔۔

"۱۱ر جولائی کی صبح بعلبک کے کھنڈر دیکھے، ۲ بجے حمص پہنچے، شام کو حمص کی زیارتیں کیں۔۔۔ یہاں کے باشندوں میں جذبۂ ایمان ہے مسلمان غریب اور اکثر صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں، تہذیب یورپ سے بہت کم متاثر ہیں۔

"میدانِ یرموک کی زیارت کی اور حضرت عکرمہؓ ابن ابی جہل کے مزار پر

فاتحہ پڑھی، . . . . . جامع خالد بن ولید کو ڈھا کر (جو ملک الظاہر نے بنائی تھی) سلطان عبدالحمید نے نئی تعمیر کرائی ہے۔ شاندار عمارت ہے . . . . . مسجد کے شمال مغربی گوشہ میں ایک چھوٹا خوبصورت گنبد ہے۔ اس میں حضرت خالد بن ولیدؓ اور ان کے فرزند حضرت عبدالرحمٰنؓ کا مزار ہے۔ شمال مشرقی کونہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا مزار ہے ——— حمص کے شمال کی جانب بہت فاصلہ پر انگور کے کھیت ہیں۔ ایک بوسیدہ چوکھنڈی کے اندر حضرت عکرمہ اور بابِ ترکمان کے پاس جس کے آثار ابھی باقی ہیں، حضرت وحیہ کلبیؓ کا مزار ہے"۔[1]

احقر نے مرحوم کی زبانی سُنا کہ حضرت خالد بن ولید کے مزار پر پہنچ کر مرحوم از خود رفتہ ہو گئے اور دیر تک متحیّر اور پھر اشک بار رہے۔

حماۃ

"۱۲ر جولائی ۱۹۳۱ء صبح ۷ بجے حمص سے روانہ ہوا۔ ۸½ بجے حماۃ پہنچا۔ قدیم وضع کی آبادی ہے . . . مسجد زکریا بہت وسیع مسجد ہے۔ اس کا صرف ایک مینار ہے۔ سلطان . . . . . نے ۶۸۴ھ میں بنائی تھی۔ اس کے ایک دروازے پر لکھا ہے کہ ۷۰۴ھ میں اس کی تجدید کی گئی۔ لیکن موجودہ عمارت جدید ہے۔ منبر کے بازو حضرت زکریا علیہ السلام کا مزار بتایا جاتا ہے ——— ۹۶۶ھ میں ابو محمد مصطفیٰ ابن میر حسین الحسینی نے جو حلب کا حاکم عدل تھا، اس میں اضافہ کیا۔ پھر ۱۱۶۰ھ میں سلطان محمود خاں ولد سلطان عبدالحمید خاں نے بعض حصّے بڑھائے۔ صحن میں اوقات نماز معلوم کرنے کے لئے ایک سورج گھڑی رکھی ہے جس میں علم ہیئت کے لحاظ سے مذہب شافعی و امام ابوحنیفہ کے بموجب سایہ کی حالت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ گھڑی ۱۲۹۸ء میں جمیل پاشا حاکم حلب کے حکم سے بنائی گئی تھی"۔ (ص ۲۱، ۲۲)

[1] سفرنامہ ص ۱۷ تا ۲۰

حلب ۱۴ر جولائی ۱۹۳۱ء (م ۲۷ صفر ۱۳۵۰ھ) پہنچے، حلب پستہ کی کاشت کے لئے مشہور ہے۔ لاکھوں روپیہ کا پستہ یورپ اور امریکہ برآمد کیا جاتا ہے۔ . . . . . دکتور عبدالرحمٰن الکیال سے ملاقات ہوئی۔ ان سے رابطۂ اسلامیہ کے مسئلہ میں گفتگو ہوئی . . . . الھوں نے مجھے ساتھ لے جاکر بعض آثار قدیمہ دکھائے اور مدرسہ عثمانیہ کا معائنہ کیا۔ شیخ مدرسہ اور علماء سے مذہبی واجتماعی مسائل پر گفتگو کی، . . . . حلب اور شام کی مسجدوں میں مینار سے زمانہ تعمیر پہچانا جاسکتا ہے۔ جن مساجد کے مینار مربع ہیں وہ ترکوں اور چرسیونی سے قبل کی تعمیر ہے اور جن کے مینار مخروطی ہیں وہ ترکوں کے زمانہ کی اور مسدسی شکل چوکسوں کے زمانہ کی تعمیر ہے . . . . . . پانچ بجے جمیل بک جنید پاشا آئے تھے، اپنے ساتھ قلعے کی سیر کے لئے لے گئے جو وسط شہر میں ہے . . . . . ایک گنبد، حمام، مساجد اور تہ خانوں کے آثار باقی ہیں۔ ایک مسجد پر سنہ تعمیر ۵۶۳ھ درج ہے . . . .'' (ص ۲۲، ۲۳)

۱۵ر جولائی کو مدرسہ حلویہ دیکھا اور اس کے محراب کی زیارت کی جو لکڑی کا بنا ہوا ہے اور صنعت نجاری کا بے مثل نمونہ ہے، بیزنطین کے آثار سے ہے لیکن اس کی تجدید ہوتی رہی ہے۔ ۶۴۳ھ میں سلطان ابوالمظفر یوسف بن ناصر کے زمانہ میں اس کی تجدید ہوئی تھی۔ محراب پر سیپ کا کام تھا جو اب باقی نہیں صانع کا نام ابی الحسین محمد ابن الحرانی ہے . . . . . . شیخ عبدالجلیل الورا امیر اوقاف حلب سے ملاقات دمشق میں ہوئی تھی، آج ان سے ملنے گیا تھا، وہ اپنے ساتھ شیخ مرتونی والئی حلب کے یہاں لے گئے، تعلیم یافتہ اور باخبر جوان آدمی ہیں، . . . .'' (ص ۲۴، ۲۵)

دمشق ۱۹ر جولائی ۱۹۳۱ء کو قسطنطنیہ سے جو مکتوب لکھا ہے اس میں دمشق

سے متعلق یہ پُر اثر جامع اجمالی ذکر ہے،

"پھر دمشق آیا، سلاطین بنی امیّہ کا پایۂ تخت، انبیاء علیہم السّلام کا مسکن، صحابائے رسولؐ کا میدانِ جنگ، قتلِ حسینؓ کے منصوبوں کا مرکز، وہ جگہ جہاں پہنچکر خلافتِ رسولؐ، سلطنت سے بدل گئی، حضرت بلال حبشیؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زینب بنتِ فاطمہؓ، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عبیداللہ ابن الجراحؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت ام سلمیٰؓ وام جبیبہؓ (ازواجِ رسولؐ)، حضرت صہیب رومیؓ، حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ، حضرت محمد ابنِ حنیفہؒ، وغیرہ وغیرہ کی زیارت اور ہز ہائی نس امیر سعید بن علی الجزائری، شیخ تاج الدین رئیس الوزراء، محمد علی بک ابنِ عابد پاشا، مولانا بدرالدین محدثِ دمشق، شیخ عبدالرحیم مشائخ سلسلہ شاذلیہ وغیرہ وغیرہ اکابر و علماء کی ملاقات سے مستفید ہوا، دعوتیں کھائیں۔ دمشق کی نہروں کے کنارے شربت کے دَور اُڑا کر حافظ کے کنارِ رکن آباد اور گلگشتِ مصلّٰی کی ہنسی اڑائی، مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ راجدھانی پر فرانسیسیوں کا غلبہ دیکھ کر دوڑے ہوئے سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر پر گئے، اور رو رو کر پوچھا کہ "کیا یہی زمین ہے جس کے لئے تم نے خون کی ندیاں بہائی تھیں؟ سارے یورپ کے متفقہ سیلاب کا، انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کی متحدہ فوجوں کا مقابلہ کیا تھا؟ کیا یہ اعتقاد غلط ہے کہ روحیں سنتی اور جانتی ہیں؟ اگر سنتی اور جانتی نہیں تو کیا بیت المقدس کو یہودیوں کا وطن اور شام کو فرانسیسیوں کی آماجگاہ دیکھ کر عرش کے کنگورے نہیں ہلا سکتیں؟"

کانوں نے کچھ سُننا شروع کیا، قلب نے کچھ محسوس کیا، آواز شاید یہی تھی کہ "بے وقوف اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

. . . ."[1]

ترکی، عراق، ایران اور افغانستان

ان ممالک پر سفرنامے میں بہت تفصیلی تاریخ وار یادداشتیں تقریباً دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ سب اشارات ہیں اور خود انتخاب لاجواب، اس کا مزید اختصار کوشش کے باوجود اپنے بس سے باہر ہے اور کل روئداد کا نقل کر دینا سوانح پر بھاری، اس لئے اب عراق سے متعلق ایک مکتوب اور کہیں کہیں تاریخوں کے اضافوں کے ساتھ ان ممالک سے متعلق خواجہ حسن نظامی مرحوم کے اجمالی تبصرہ ہی اکتفا کرتا ہوں جو پہلے ہی سے اس تالیف میں شریک ہے، اور وہ یہ ہے :-

ٹرکی جمعہ ۱۷ جولائی ۱۹۳۱ء (یکم ربیع الاول) کو بہادر یار جنگ استنبول پہنچے۔ مرحوم نے ٹرکی کے نئے پرانے تمام شہر دیکھے، فرماتے تھے کہ سب عورت مرد یورپین لباس میں ہیں، مرحوم سرخ رنگ کی ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے، بڑی عمر کی ترکی عورتیں اس ٹوپی کو محبت کی نظر سے دیکھتی تھیں، جوان عورتیں حقارت کی نظر ڈالتی تھیں، اور سنجیدہ اور تعلیم یافتہ مرد حسرت سے دیکھتے تھے، چنانچہ ایک ترک تخلیہ میں مرحوم کے پاس آیا، اور خود ہی دروازہ بند کرکے مرحوم کی طرف بڑھا، فرماتے تھے کہ "مجھے اس کی نیت پر شبہ ہوا، میں نے خفیہ طور پر

---

[1] سفرنامہ ص ۲۰۹، ۲۱۰

اپنی پستول سنبھالی اور کچھ آیتیں پڑھنے لگا، لیکن میں نے دیکھا کہ اس نے آگے بڑھ کر نہایت لجاجت کے ساتھ مجھ سے لال ٹوپی مانگی، میں نے اجازت دی، اس نے اپنی یورپی ٹوپی اتار کر وہ ٹوپی اوڑھ لی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر ایک ٹھنڈا سانس لیا۔" مرحوم کے سوال پر کہا کہ میرا بادشاہ یورپین ٹوپی کو پسند کرتا ہے، اِس لئے میں بھی اس کو پسند کرتا ہوں لیکن میرا دل قدیم ٹرکی ٹوپی کو پسند کرتا ہے"۔

قسطنطنیہ

قسطنطنیہ کے ایک قہوہ خانہ میں مرحوم کے قریب ایک ترک خاندان یورپین لباس میں بیٹھا تھا، مرحوم نے ترک عورتوں کے یورپین لباس کے متعلق کچھ گفتگو فرمائی تو ایک جوان لڑکی نے اپنے بھائی سے کہا کہ "یہ شخص مجھے مسافر معلوم ہوتا ہے اس لئے ہمارے لباس کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں یا نہیں"۔ کہو "الحمدللہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہماری رگوں میں جو خون ہے وہ اب تک اسلام پر قربان ہونے کے لئے تیار ہے لیکن یہ مسافر انگورہ اور قسطنطنیہ کو دیکھ کر ترکوں کی حالت کا اندازہ نہ لگائے' یہ دونوں شہر تو دیوانے ہو گئے ہیں' ترکوں کی اصلی حالت دیکھنی ہے تو اناطولیہ جائے' وہاں اصلی ترک نظر آئیں گے" مرحوم فرماتے تھے کہ جب اناطولیہ گیا تو واقعی وہاں ترکوں کا قدیم لباس بھی موجود ہے۔ لمبی ڈاڑھیاں بھی ہیں، عورتوں کا پردہ بھی ہے اور مسجدیں بھی ہیں۔

میلادالنبیؐ کی رات

۱۲ ربیع الاول کی شام کو قسطنطنیہ میں تھے، یاد نہ تھا کہ اس روز ۱۲ تاریخ تھی، یکایک تمام مسجدوں کے میناروں پر برقی روشنی ہوگئی، مرحوم نے حیران ہو کر

اس کی وجہ پوچھی، ترکوں نے کہا آج ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا دِن ہے۔

لیکن مسجد خاموش

لیکن اسی شام کو مرحوم مسجد اباصوفیہ میں نماز کے لئے گئے تو ہر طرف سنّاٹا تھا، ایک ترک کچھ وظیفہ پڑھ رہا تھا، ایک نماز پڑھنے آیا تھا، اور ایک نماز پڑھ کر جارہا تھا۔ اِتنی بڑی تاریخی مسجد اور مصلّیوں کا یہ حال! لیکن جو مسجدیں آبادی میں ہیں وہاں بڈھے ترک نماز کے لئے جاتے ہیں اور مسجدیں بھر جاتی ہیں۔

ہندوستانیوں سے نفرت

ترکوں کی موجودہ حکومت کو ہندوستانیوں سے سخت نفرت ہے، مرحوم نے مصطفےٰ کمال پاشا سے انگورہ میں (جہاں وہ آتے ہوئے تھے) ملاقات کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی، پھر دوسرے شہر میں جہاں مصطفےٰ کمال گئے، وہاں جاکر کوشش کی لیکن پھر بھی ناکام رہے، وزیرخارجہ نے ہر دفعہ انکاری جواب دیا، عوام سے معلوم ہوا کہ ترکی حکومت کے اراکین ہندوستان کے بعض جاسوسوں کی وجہ سے ہندوستانیوں کو شک اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

عربی حروف کی جگہ لاطینی حروف رائج ہو رہے تھے، مرحوم کو مایوسی ہوئی جب انھوں نے عربی پسند کرنے والوں میں کسی عملی اقدام کی خواہش نہ دیکھی، فرمایا "اگر حکومت لاطینی حروف کو رائج کر رہی ہے تو پبلک میں ایسے افراد ہونے چاہیے تھے جو عربی حروف کے تحفّظ کے لئے ایسی تدابیر اختیار کریں جو قانون حکومت کے خلاف بھی نہ ہوں اور عربی حروف کا تحفّظ بھی ہو جاتے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی اعتبار سے ترکی قوم

ایک بڑے خطرہ کی طرف جا رہی ہے۔ تاہم ہر یورپین نما ترک میں اسلام کا اتنا اثر ہے کہ جب کسی سے پوچھو کہ تم مسلمان ہو تو وہ بڑے جذبے اور جوش کے ساتھ جواب دیتا ہے۔ الحمدللہ میں مسلمان ہوں"۔

انقرہ

یہ موجودہ حکومت کا پایہ تخت اور ترقی پذیر شہر ہے، یہاں بھی مرحوم نے یورپی تمدن ہی کو سرایت کئے پایا، البتہ عسکی شہر وغیرہ جیسے پرانے شہروں میں قدیم تمدن بھی پایا گیا۔

عراق

۷۔ اگست ۱۹۳۱ء (۲۲ ربیع الاول ۱۳۵۰ ھجری) کو بغداد پہنچے سفر سخت تکلیف دِہ رہا، ایک مکتوب میں بہ طرز مزاح تحریر فرماتے ہیں :۔

"مجھے تو اندیشہ تھا کہ حضرت الحاج مولوی بہادر خاں صاحب قبلہ وکعبہ کا کہیں وصال شریف نہ ہو جائے"۔

اب آگے کام کی تفصیل کا اقتباس ملاحظہ ہو :۔

"غرض جناب موصل پہنچے، فوراً ہارون ہوٹل میں سرد پانی سے حمام کیا اور ٹھنڈی ہوا میں سو گئے۔ دو روز رہ کر نینوا کے کھنڈروں پر آنسو بہائے۔ حضرت جرجیس، حضرت شیث، حضرت یونس، حضرت دانیال علیہم السلام کی بارگاہوں میں حاضری دی۔ حضرت اویس قرنیؓ کا مکان دیکھا۔ پٹرول کے کنوؤں کی نسبت معلوم ہوا کہ یہاں نہیں کرکوک میں ہیں، ورنہ ارادہ تھا کہ کم از کم اس کاغذ کو موصل کے پٹرول میں بھگو کر بھیج دیتا، آپ بھی اس کی بُو سے مشرف ہو جاتے ——— موصل سے گذشتہ دوشنبہ کو بغداد پہنچا۔ حضرت غوث پاک قطب الاقطاب شیخ عبدالقادر جیلانی

کی بارگاہ پر حاضری دی، حضرت جنید بغدادی، حضرت ابو بکر شبلی، حضرت امام ابو حنیفہ امام اعظم، حضرت معروف کرخی، حضرت عمر شہاب الدین سہروردی، حضرت بہلول دانا، حضرت امام موسیٰ کاظم، حضرت سری سقطی، حضرت امام ابو یوسف وغیرہ رحمہم اللہ اولیائے وائمہ عظام کی بارگاہوں پر حاضر ہوا ـــــــ اشوریوں، بابلیوں، کلدانیوں کے کچھ آثار دیکھے، کل سامراہ گیا تھا، سلطان المعتصم باللہ کا ٹوٹا ہوا محل، مسجد جامعہ کا عجیب وغریب مینار دیکھا اور حضرت امام حسن عسکری، حضرت امام علی نقی علیہما السلام کی بارگاہ پر سلام کیا۔ وہ غار دیکھا جہاں امام محمد ابن حسن (جو بہ اعتقاد......اہل شیخ مہدی آخر الزماں تھے) غائب ہو گئے۔ طاقِ کسریٰ کے پاس کھڑے ہو کر تھوڑی دیر مدائن کے کھنڈروں کی سیر کی، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ پر حاضر ہو کر آنکھیں بند کیں اور کسی کو ایران سے تلاشِ حق میں نکلتے اور مدینہ میں منزلِ مقصود پاتے دیکھا۔

غرض وہ سب کچھ دیکھا اور دیکھ رہا ہوں جس کو دیکھ کر ایک صاحبِ عقلِ سلیم اپنا قلب روشن کر سکتا ہے لیکن آہ میں اور میرا قلب!"

(یہ مکتوب بغداد سے ۶ مہر ۱۹۴۰ ف کو لکھنا شروع کیا اور ۱۷ دِن بعد ۲۳ مہر ۱۳۴۰ ف کو طہران پہنچ کر ختم فرمایا) [1]

ایران

۲۱۔ اگست ۱۹۲۱ء کو ایران پہنچے۔ یورپی تمدّن کی ہوا نے ایران کی تمدّن کو بھی مسموم کر رکھا ہے، عورت و مرد دونوں میں یورپین بننے کا اشتیاق ہے ان کے اندر وطنی تحریک بڑھ رہی ہے اور اسلامی احساس کم ہو رہا ہے۔ ان کے دینی پیشوا بھی وطنی رنگ کی

---

[1] بہادر یار جنگ کا سفر نامہ ص ۲۱۶ تا ۲۲۰

طرف جا رہے ہیں، قائدِ ملت مرحوم رضا شاہ پہلوی سے نہ مل سکے، کیونکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے، البتہ وزرائے سے ملاقاتیں ہوئیں، موجودہ ایران کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ وہ قدیم مہمان نوازی کے افسانوں سے خالی ہے، ایرانی بہت زیادہ مبالغہ کرتے ہیں، ان کی آج برسوں تک ختم نہیں ہوتی، گویا ان کے ضمیر اور ان کی زبان کا فاصلہ بہت بڑھ گیا ہے، اور وہ ایران کے قدیم زرتشتی مراسم اور خیالات کو بھی پسند کرنے لگے ہیں، ان میں سے بعض آزادی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے شیعہ مذہب اسی واسطے اختیار کیا تھا کہ مسلمانوں کی عالمگیر اخوت سے علیحدہ اور ممتاز رہیں، ہم ہی نے حضرت علیؓ کو بہت بڑا بنا دیا اور ہم ہی نے حضرت حسینؓ کو اتنا زیادہ مشہور کیا۔

وسط ایشیا

مرحوم نے ایران کے بعد وسط ایشیا کا ایک حصّہ دیکھا، ہرات کے مسلمانوں کا اچھا اثر ہوا، جس طرح شام، مصر، فلسطین اور عراق ایک ہادی و مصلح کے ظہور کا انتظار کر رہے ہیں، اسی طرح وسط ایشیا کے مسلمانوں میں بھی تبدیلی و ترقی کی زبردست خواہش محسوس ہوئی اور اسلامی جذبہ پایا گیا۔

افغانستان

۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو افغانستان آئے، یہاں غازی نادر شاہ سے مرحوم کی کئی دفعہ ملاقات ہوئی اور افغانوں کے سب عام و خاص لوگوں سے ملاقاتیں کیں، مرحوم کا خیال ہے کہ مہمان نوازی اور اسلامی اخلاق کے اعتبار سے افغانستان تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے اور اس کے اندر اسلامی جذبات اور اسلامی غیرت و حمیّت کی خواہش کے ساتھ ہی نئی ترقیوں اور تبدیلیوں کی بھی زبردست

خواہش پائی جاتی ہے، مرحوم غازی نادر شاہ کے بہت مدّاح تھے، ان کی متانت، سنجیدگی، دینداری، سیاسی تدبر اور ان کے عمدہ انتظامات کا مرحوم پر بہت اچھا اثر رہا۔

افغانستان کے انقلاب کے وجوہ و نتائج سے متعلق نواب صاحب کی ڈائری میں یہ اشارات درج ملے:۔

"امان اللہ۔ بادشاہ ترقی خواہ وطن و ملّت۔ علوم و معارف میں ترقی دی۔ تعلیم جبری کرادی۔ صنعت میں ترقی دی۔ کارخانۂ کبریت سازی قائم کیا۔ رعایا کی تشویق کے لئے یادگاریں بنوائیں۔ پغمان اور دارالامان کی تعمیر کی۔ شہر کو آراستہ کیا۔ دیگر حکومتوں سے اچھے تعلقات پیدا کئے اس کے ساتھ ہی تقلیدِ یورپ میں افراط کی۔ عورتوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ عمامہ اور ٹوپی کو یورپی ٹوپی سے حکماً بدلا۔ جمعہ کی تعطیل موقوف کر کے پنجشنبہ کو تعطیل قرار دی۔ علماء کی تحقیر کی، ان کے وظائف بند کئے۔ جرگہ میں ان کے عمامہ اتروا کر یورپی ٹوپی پہنائی، خود کی سرپرستی کی، انگریزوں کے خلاف عام جلسوں میں عاقبت نا اندیشانہ کلام کیا۔ نادر خاں جیسے مدبّر کو نہ صرف ملک سے دور کیا بلکہ اپنا مخالف بنالیا۔ سپاہ کی تنخواہیں کم اور ان کی تعداد گھٹادی ——— جب انقلاب ہوا تو بہت سی سیاسی غلطیاں کیں۔"

اس کے بعد اسبابِ زوال پر یہ اشارات ہیں:۔

"فوج کی تنخواہ میں کمی، بے جا اعتماد، علماء کی تحقیر و تذلیل، تعلیم کا جبری قرار دینا۔ اپنی اصلاحات کے اجراء میں عجلت، لباس کی تبدیلی، عورتوں کی بے پردگی" [1]

---

[1] سفرنامہ ص ۲۸۸، ۲۸۹

ختم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو صاحبِ دل، صاحبِ نظر سیّاح کا وہ سفر جو اتبدائے اپریل ۱۹۳۱ء سے شروع ہوا تھا، کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ ہندوستان آکر بہادر یار جنگ نے اپنے تاثرات سفر حیدر آباد دکن میں بھی کئی کئی تقریروں میں سنائے اور دہلی میں بھی بیان کئے، لیکن جو کچھ فرمایا سب کا سب محفوظ نہ ہو سکا۔ حیدر آباد کی تقریروں کا خلاصہ جو اخباروں میں چھپتا رہا، نہایت تشنہ تھا، دہلی کی تقریریں سُنکر خواجہ حسن نظامی مرحوم نے جو سفرنامہ مرتب فرمایا وہ مختصر سہی مگر اس وقت خاصہ کی چیز تھی۔

مرحوم سیاح عظیم کو یہ فرماتے خود میں نے سُنا کہ :-

"میں نے اپنی معلومات زیادہ تر آیات تکوینی ہی سے بڑھائی ہیں۔"

عالمِ اسلام پر قائدِ ملّت کی سیاحت کا اثر

تفصیلی حکایت کو چھوڑ کر صرف ایک مجموعی اور اجمالی اندازہ لگانے کے لئے کہ ششماہا سیاحت میں بہادر یار جنگ نے اپنی شخصیت کا کیا اثر اسلامی بلاد کے زعماء پر چھوڑا اور ان میں اتحاد و اصلاحِ ملّت کی کیسی تحریک پیدا کر دی، یہاں ہم شائع شدہ سفرنامہ سے وہ ترجمہ شدہ اعلامیہ نقل کرتے ہیں جو طرابلس کے اللجنتہ التنفیذیہ (برقہ) کے صدر کی طرف سے شائع ہوا تھا، ملاحظہ ہو :-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گذشتہ چند صدیوں کے تاریخی واقعات کے مطالعہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جماعتی انتشار اور فرقہ بندیاں جو کتاب اللہ اور سُنّتِ نبوی ؐ سے غفلت و اعراض کا نتیجہ ہے، اسی کی وجہ سے غیر اقوام

کو یہ موقع ملا ہے کہ ان کے ایک فرقہ کے بعد دوسرے فرقے اور ایک گروہ کے بعد دوسرے گروہ کے گلے میں ذلّت و حرماں نصیبی کا طوق پہناتے جائیں، چونکہ ایک فریق کو دوسرے فریق کے ساتھ ہمدردی کے احساسات نہیں رہے اس لئے ایک فریق دوسرے کی مصیبتوں سے بے حس رہنے لگا۔ ایک طویل عرصہ اِس بے حسّی کا گزرنے کے بعد خدا نے بعض دردمند قائدینِ امت کو پیدا کیا جو اپنی باعمل قیادت کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر بیداری اور اجتماعی شعور و احساس کی روح پھونکنے لگے اور مسلمانوں کی اس خدمت کے لئے اپنی زندگی کے لمحات کو وقف کر دیا۔ اس لئے انھوں نے ان تدبیروں پر غور کرنا شروع کیا جن کے ذریعہ امتِ اسلامیہ کے جسم کے اس ناسور کا علاج کیا جائے۔ انہی باعمل افراد میں سے اِس دَور میں عزت مآب نواب بہادر یار جنگ ہیں، جو ہند کے نامور قائدین میں سے ہیں۔ مختلف بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کرتے ہوئے آپ دمشق تشریف لائے۔ آپ کی سیاحت کا مقصد اوّلین یہی رابطۂ اسلامیہ کی زنجیر کے لئے کڑیاں پیدا کرنا ہے۔ آپ نے دمشق کے اکابر قائدین سے ملاقاتیں کیں۔ جن میں سے قابلِ ذکر مجاہدِ ملّت شکری بک القوتلی اور مجاہدِ ملّت بشیر بک السعدادی ہیں۔ ان سے اس اہم مسئلہ پر گفتگو رہی۔ اسی طرح انھوں نے مصر میں عزت مآب احمد زکی پاشا اور عزّت مآب محمد علی پاشا سے ملاقات کی اور قدس میں مجلسِ اسلامی اعلیٰ کے صدر سیّد امین الحسینی سے ملاقاتیں کیں اور سب کے اتفاق سے حسبِ ذیل تجاویز پاس کئے گئے کہ :۔

ا۔ مسلمان آجکل جس اشتات و انتشار کے دَور سے گزر رہے ہیں۔

اس کے علاج اور تدارک کے لئے ایسے وسائل کی تشکیل کی جائے جو ان کے اندر اتحاد و یکجہتی کے امکانات کو پیدا کریں اور ان کو اجتماعی احساس کی طرف مائل کریں۔

۲ ۔ روابطِ ملّی کے امکانات کے حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ایک دوسرے کے حالات اور اضطرابات سے واقفیت اور باخبری ہے اور اس کے لئے ایک انجمن کا قیام پیشِ نظر ہے جس میں مختلف ممالکِ اسلامیہ کے قائدین ارکان بنیں اور اپنے اپنے ملکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے امم اسلامیہ کی بے چینیوں کے اسباب اور ان کے دُور کرنے کی کی تدابیر سے بحث کریں گے اور ان کے کھوئے ہوئے وقار کی بازگشت کی عملی تجاویز پیش کریں گے۔

۳ ۔ اِس انجمن کے قیام کے بعد ایک نمائندہ کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ جو وقت و مقام کا تعیّن کر کے تمام اقطار اسلامیہ سے باعمل افراد کو مدعو کرے گی، اور جو کمیٹی کہ قُدس شریف میں قائم ہو گی اس میں مصر اور فلسطین کے نمائندے شامل رہیں گے اور اس مسئلہ میں تبادلۂ خیال کریں گے۔

۴ ۔ بہادر یار جنگؒ اس کمیٹی کے اہم ارکان میں سے ہوں گے جو مصر و فلسطین کے اکابر و زعمار سے وقتاً فوقتاً مراسلت کیا کریں گے۔

۵ ۔ نواب بہادر یار جنگ نے اس عمل کے نفاذ کے مقصد سے جن جن شہروں کا دورہ کیا ہے اور وہاں کے جن قابل اصحاب سے گفتگو کر کے ان میں کام کرنے کی ہمّت و رغبت پائی ہے ان کے ناموں کی ایک فہرست مرتب کر کے ہمارے پاس روانہ فرما دی ہے تاکہ بوقتِ ضرورت

ان سے ربط قائم کیا جا سکے۔ فقط

السعدادی

صدر کمیٹی فکر وعمل (الجنتہ التنفیذیہ)

برقہ (طرابلس)

دیدہ ور بہادر یار جنگ کی یہ تحریک زندہ و قوی رہتی تو آج مسلمانوں سے قبلۂ اوّل کیوں چھن جاتا اور اسرائیل کا دبدبہ اور طنطنہ کیوں قائم ہوتا، اور مسلمان کی وہ ذلّت کیوں ہوتی جو ہوتی ہی چلی جارہی ہے، فیا اسفی،

نواب صاحب کے سفر بلادِ اسلامیہ پر خواجہ حسن نظامی کا جامع تبصرہ

"موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمانوں نے ملکوں کی سیر کی اور سفر نامے لکھے جن میں ایک میں بھی ہوں اور مرحوم مولانا شبلی بھی ہیں اور مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر "پیسہ اخبار" لاہور بھی ہیں اور بھوپال کے ایک مسلمان بھی ہیں، جنھوں نے اسپین کا بہت اچھا سفر نامہ لکھا ہے اور حافظ عبدالرحمٰن امرتسری بھی ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ایک ہی وقت میں تمام اسلامی دنیا کے ملکوں اور قوموں کو دیکھا ہو اور مذہبی اور سیاسی اور معاشرتی مقاصد سامنے رکھ کر دیکھا ہو۔ اِس لحاظ سے نواب بہادر یار جنگ مذکورہ سیاحوں سے اعلیٰ ہیں کہ انھوں نے مسلسل سفر کیا اور چھ مہینے میں عراق اور حجاز اور شام اور فلسطین اور مصر اور ایران اور قسطنطنیہ اور انگورہ اور وسط ایشیا اور افغانستان وغیرہ سب ملکوں کو بہت گہری نظر سے دیکھا، وہاں کے علماء کو دیکھا، اربابِ حکومت کو دیکھا، اخبار نویسوں کو دیکھا، ہر قسم کے رہنماؤں کو دیکھا اور ان سب مذکورہ مقاصد کے

ماتحت مباحثے کئے اور ان سے نتائج نکالے۔ پس میرے عقیدہ میں اسپین کے ابنِ بطوطہ سے بڑھ گئے۔ تاہم میں قدیمی کی عظمت و عزّت کو باقی رکھنے کے لئے نواب بہادر یار جنگ کو ابنِ بطوطہ سے زیادہ نہیں بلکہ ابنِ بطوطہ کے برابر سمجھ کر نواب ابنِ بطوطہ خطاب دیتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ حیدر آباد میں نہیں اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے موجودہ مسلمانوں میں کسی مسلمان نے ایسا جامع اور وسیع سفر اس زمانہ میں نہیں کیا۔

میں نے بھوپالی صاحب کے سفرنامہ کو اردو زبان کے سفرناموں سے زیادہ مؤثر اور کامل سفرنامہ لکھا تھا اور اب بھی میرا یہی خیال ہے۔ لیکن اگر نواب بہادر یار جنگ اپنے سفرنامے کو ویسا ہی لکھ سکیں جیسا کہ وہ بولتے ہیں اور جیسا کہ انھوں نے گہری نظر سے سیاحت کی ہے تو اُن کا سفرنامہ اردو زبان کے سب سفرناموں سے بڑھ جائے گا۔[1] . . . . . . اور اسلامی دنیا کے سب ممالک کا آئینہ سمجھا جائے گا اور اگر مجھے فرصت ہوتی تو میں اپنا سفرنامہ پورا کرتے ہی حیدر آباد چلا جاتا اور نواب صاحب کے پاس بیٹھ کر ان کا سفرنامہ اپنی زبان میں مرتب کر دیتا لیکن مجھے اُمّید ہے کہ نواب بہادر یار جنگ جیسا عمدہ بولتے ہیں، ویسا ہی عمدہ لکھ بھی لیں گے، اگر وہ تلوار ہاتھ سے رکھ کر قلم اٹھالیں“۔

---

[1] جو سفرنامہ چھپ چکا ہے گو وہ صرف یادداشتوں کا مجموعہ ہے پھر بھی وہ واقعتہً بڑھا ہوا ہی ہے!

سہ سالہ تبلیغی کارنامہ

کار پاکاں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است (رومی)

عمر کے ابتدائی برس مجاہدۂ نفس میں صرف ہوتے (اور حقیقتاً یہ چیز تو زندگی کی آخری سانس تک جاری رہی) جب اختیار و اقتدار ملا تو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "وانذر عشیرتک الاقربین" (اے محمدؐ ڈراؤ اپنے قریبی رشتہ داروں کو) کا حکم پا کر جس طرح سب سے پہلے اپنے عزیزوں کو دعوتِ حق دی تھی، اس عاشقِ رسولؐ نے بھی اتباعِ نبوی میں اپنے گھر والوں ہی کی پہلے اصلاح کی، پھر جو بیت اللہ کی زیارت نصیب میں آئی، اور ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت کی تو مشاہدہ نے مسلمانوں کی بے راہ روی، ان کی اندھی تقلید، ان کی خود ناشناسی اور خدا ناآشنائی کے گہرے داغ دل پر چھوڑے، مرحوم نے دنیا کے ہر بازار میں جنسِ ایمان کی کمی دیکھی، ہر دماغ میں سودائے خام پایا، ترقی کے دعوے سُنے، تنزل کے اعمال دیکھے، عقل نے سمجھایا، دل نے تصدیق کی کہ یہ تہ بہ تہ تاریکی بلا ایمان کی شمع جلائے

دور نہ ہوگی، ہندوستان لوٹے تو اسی کسک اور اُمنگ کو لئے ہوئے آئے کہ جہاں تک ہو سکے کفر کے نقوش کو مٹا کر دینِ اسلام کا بول بالا کیا جائے!

تبلیغِ اسلام کی اہمیت اور ہمارا المیہ

تبلیغِ دین مسلمانوں کا فرض ہے، لیکن آج چند نفوس قدسیہ کو چھوڑ کر کتنے عامی نہیں علماء اس جانب متوجہ ہیں؟ لیکن یہ بے اعتنائی آج غلامی ہی کے دَور کی نہیں ہے بلکہ اس وقت بھی برتی گئی تھی جبکہ مسلمانوں کی حکومت ملکِ ہند میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی[1] ــــــــ مغلیہ دَور میں تبلیغ کا کام حکومت کی جانب سے کتنا ہوا؟ صدہا برس کی حکومت، پھر غیر مسلموں کی اکثریت، آخر کیا معنی رکھتی ہے؟ ہمارا کہنا یہ نہیں کہ کیوں تلوار کے زور سے اسلام پھیلایا نہیں گیا بلکہ منشا یہ ہے کہ "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْن" کے قرآنی مسلک کو پیشِ نظر رکھ کر تبلیغ کے مؤثر سامان کیوں نہیں کیئے گئے۔ یہ مسلمانوں کی تعداد جو اس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے، سب کی سب "درآمد" کا نتیجہ تو نہیں۔ "درآمد" تو بہت کم ہوئی۔ باقی سب تبلیغ ہی کا نتیجہ ہے لیکن اس کا سہرا کن کے سر ہے؟ بادشاہوں کے یا بادشاہ نواز گلیم پوشوں کے؟ بابر، ہمایوں، شاہ جہان وغیرہ کے یا حضرت چشتی رح، محبوب الٰہی رح اور چراغ دہلوی رح وغیرہم کے؟ سلطان قلی قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کے یا

---

[1] اور اب پاکستان بننے کے بعد بھی وہی بے اعتنائی اور غفلت ہے، بلاشبہ قابلِ قدر ایک "تبلیغی جماعت" ہے مگر اس کا دائرہ کار خود مسلمانوں کی جزوی اصلاح ہے اور پاکستان میں غیر مسلموں پر تبلیغ سے وہ یکسر گریزاں ہے جبکہ اس نوزائیدہ مملکت میں عیسائی مشنری ہزاروں مسلمانوں کو عیسائی بنا چکی ہے اور بنا رہی ہے، یا للعجب!

باباشرف الدینؒ[1] اور خواجہ گیسو درازؒ[2] کے؟

جو کام شاہوں سے نہ ہوا، وہ درویشوں نے کر دکھایا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ کام پاک نفس، باخدا، صاحبِ عزیمت انسانوں کے کرنے کا ہے اور بڑی اہلیت چاہتا ہے۔ ع

یہ خاک پاک ہر نااہل سے چھانی نہیں جاتی

سیرتِ نبوی شاہد ہے کہ یہ راہ بغیر آبلہ پائی کے طے نہیں ہوتی، پھر کبھی ترغیب کی بیڑیاں آگے بڑھنے سے روکتی ہیں، اور کبھی ترہیبت کے آہنی قلعے، ارادوں کو پست کر دیتے ہیں ——— صاحبِ نظر عاشق سیرت نبوی بہادر یار جنگ کی زبانی حیاتِ طیّبہ کے اس پہلو کو سُنیئے:-

"آیئے ان کی حیاتِ طیّبہ کے صرف اس پہلو پر غور کریں کہ آپ نے فریضۂ بلاغ کو، جو ان کا مقصدِ حیات تھا، اور صرف جس کے لئے وہ مبعوث کئے گئے تھے، کس طرح ادا کیا اور ہمارے لئے اپنی زندگی کا کیا نمونہ چھوڑ گئے۔

وہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جو عبداللہ کے یتیم کی حیثیت سے خاندان بنی ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔ وہ محمدؐ جن کو عبدالمطلب کے پوتے اور بعد کو ابوطالب کے بھتیجے کی حیثیت سے کوئی کڑی

---

[1] شیخ سعدی کے پیر بھائی، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ، دکن میں اسلام کی پہلی شمع جلائی تھی، مزار شہر حیدرآباد کے باہر چند میل پر ایک پہاڑی پر ہے اور زیارت گاہ عام ہے۔

[2] حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے جلیل القدر خلیفہ، جن کا مزار مبارک شہر گلبرگہ (دکن) میں ہے۔

نگاہوں سے نہ دیکھ سکتا تھا وہ محمدؐ جن کے حرب فجار میں تیر چن چن کر نبرد آزماؤں کو دینے کی ادا مکہ والوں کے دل چھین چکی تھی، وہ محمدؐ جن کا تنصیب حجرِ اسود کا فیصلہ سرکشان قریش کو اسیر کمندِ محبت کر چکا تھا، وہ محمدؐ جن کی صداقت کی قسم کھائی جاتی تھی، وہ محمدؐ جن کی امانت میں شبہ کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ جب خدا کے اس آخری پیغام کو سنانے کے لئے صفا کی چوٹیوں پر چڑھتے ہیں اور آل طالب کو آنے والے خطرات سے جو عذابِ الٰہی کی صورت میں نمودار ہوتے ڈراتے ہیں تو تم نے دیکھا اور تاریخ نے شہادت دی کہ ان کے روئے انور پر مکہ کی خاک اڑائی گئی، ان کے پائے نازک کی خارِ مغیلاں سے تواضع کی گئی، ان کی گردنِ اقدس پر اونٹ کی غلاظت بھری اوجھ رکھی گئی۔ خلیلؑ و ذبیحؑ کا وطن ان کے پوتے پر تنگ کر دیا گیا، ان کے سر کے لئے انعام مقرر کئے گئے ——— کیا ان سب باتوں میں چشمِ بینا کے لئے روشنی اور قلبِ فہیم کے لئے سبق نہیں ہے، کہ اس دنیا میں حق و صداقت کا پیغام پہنچانا، طاغوتی طاقتوں کو دعوتِ پیکار دینا ہے اور شیطان کی ذریات کو آمادۂ جنگ کرنا ہے" ——— (خطبۂ صدارت آل انڈیا تبلیغِ اسلام کانفرنس، بمبئی ۱۹۳۸ء)

انجمن تبلیغِ اسلام کا قیام

بہادر یار جنگ کی نگاہ میں تبلیغ اسلام کی اہمیت اور ضرورت اولین درجہ رکھتی تھی، چنانچہ انھوں نے ۱۹۲۷ء میں ایک "مجلس انجمن تبلیغ اسلام" کی

بنا ڈالی اور مسلسل تین سال تک حیدر آباد کے گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ کے دَورے کیے، مشقتیں برداشت کیں لیکن تبلیغِ دین میں لگے رہے۔ ور غرض نہ شہرت سے تھی نہ عزت و حشمت سے، صرف شفقتِ انسانی کا جذبہ تھا جو نرم نرم بستروں اور عالی شان ڈیوڑھی سے نکال کر گاؤں گاؤں پھرا رہا تھا'۔۔۔۔ اس کی لذّت انھیں کے دل کو معلوم!

بیس پچیس نہیں، سَو، دو سَو نہیں، بلکہ تقریباً پانچ ہزار بے دین اس مخلص مبلّغِ اسلام کے ذریعہ راہِ حق پر آ گئے۔ ایک کافر کو کوئی شخص مسلمان کر سکے تو اخروی اجر کے کتنے سامان اُس کے لئے مہیا ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ یہاں تو (۵۰۰۰) افراد مسلمان ہو گئے، خود مرحوم تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ "الحمد للہ میرے ذریعہ پانچ ہزار (۵۰۰۰) افراد اسلام سے ہم آغوش ہوئے" ——— اور بحیثیت مجموعی اس انجمن کے ذریعہ بیس ہزار (۲۰۰۰۰) غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے بقول مولانا دریابادی "مرحوم کا کوئی ایک بھی دوسرا عملِ صالح نہ ہوتا، تنہا یہی ایک عمل ان کے مرتبہ کو کس بلند سے بلند تر مقام تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں"؟

مشکلاتِ راہ مرحوم کے اس بڑھتے ہوئے کام کو دیکھ کر حاسدوں کو تکلیف ہوئی۔ چنانچہ ایک نام کے مبلّغِ دین کو میں نے خود یہ کہتے سُنا کہ "بہادر یار جنگ کی تبلیغ، اسلام کے چہرہ پر ایک داغ ہے"۔ جب میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے "وہ عام اچھوتوں میں تبلیغ کرتے ہیں، اِس لئے بہت جلد یہ لوگ مسخّر ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کو شکایت پیدا ہوتی ہے کہ اگر مسلمان کرنا ہے تو ہمارے سامنے آئیں، اِن جاہلوں کو بہکا لے جانا کونسی مشکل

بات ہے، اس طرح اس سے خود ہم پر حرف آتا ہے"، پھر شیخی سے کہنے لگے "ہم تو بڑے بڑے برہمنوں اور پادریوں کو پکڑتے ہیں" ——— اس کا جواب بجز اس کے کیا ہوسکتا تھا کہ ع

بر ایں عقل و دانش بباید گریست

غرض اس قسم کے اعتراضوں کے علاوہ چند فتنہ انگیز مخالفین نے غلط تشہیر کرکے ان کی شکایات پولیس کے اعلیٰ حکام تک پہنچائیں۔ پولیس نے اس معاملہ میں دست اندازی شروع کی اور اپنی رپورٹ میں اضلاع اور تعلقات کے شدھی اور تبلیغی کام کو فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث قرار دیا۔ قائدِ ملّت نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے ایک خط ناظمِ کوتوالی (مسٹر ہالنس) کو لکھا، جو ذیل میں درج ہے :-

"کوتوالی اضلاع سرکار عالی کی رپورٹ نظم ونسق بابتہ ۱۳۴۶ ف کے مطالعہ کا موقعہ ملا، نیز مقامی اخبارات میں بھی اس کے اقتباسات شائع کیے گئے ——— اس وقت آپ کو مخاطب کرنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوتوالی کی عام رپورٹ پر تنقید کروں، میں صرف فقرہ نمبر ۵ کی دوسری سطر کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں جس میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی بڑی وجہ آپ نے تحریک شدھی کے ساتھ ساتھ تبلیغ کو قرار دیا ہے۔ چونکہ ۱۳۴۶ ف میں منظم تبلیغی مساعی صدر مجلسِ اسلام کی طرف سے ہوتی رہی ہے، اس لئے عام طور پر آپ کی اس تنقید سے وہی تبلیغی کوشش مراد لی جارہی ہے، مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ فرقہ دارانہ کشیدگی کو تبلیغ کی طرف

منسوب کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔"صدر مجلسِ تبلیغ اسلام"
کی جانب سے تبلیغ صرف چار اضلاع میں ہوئی ہے۔ تلنگانہ کے
اضلاع ورنگل اور نلگنڈہ میں نلگنڈہ کے تعلقات دیورکنڈہ،
سریاپیٹ وحضورنگر میں اور ورنگل کے تعلقات پاکھال اور
محبوب آباد اس سے مستثنیٰ ہیں اور مرہٹواڑی میں ضلاع اورنگ آباد
کے تعلقات بھوکردن، جالنہ اور عنبڑ میں اور ضلع بیڑ کے
تعلقات پاٹودہ اور گیورائی میں تبلیغ کی گئی۔ جاگیر کلیانی ضلع
گلبرگہ، تعلقہ سدی پیٹھ ضلع میدک اور قصبہ جڑچلہ ضلع محبوب
نگر میں چند روز کے لئے ایک ایک مبلّغ مقرر کیا گیا تھا جو جلد
موقوف کروا دیا گیا۔ ان کے سوا ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا
کہ کسی اور مقام پر "صدر مجلسِ تبلیغِ اسلام" کی طرف سے تبلیغ
ہوئی۔ جہاں تک آپ کی رپورٹ شہادت دے رہی ہے اور
مجھے واقعات کا علم ہے۔ ۱۳۴۶ ف میں مقامات مذکورہ صدر
پر کہیں کوئی فرقہ وارانہ فساد وقوع پذیر نہیں ہوا۔ ہوملہ سعد اللہ
نگر، دھارور، نرگنڈہ اور عثمان آباد کے جن علاقوں میں رپورٹ
زیرِ نظر سے فرقہ وارانہ فساد کا وقوع ظاہر ہو رہا ہے، ان میں
سے ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں کہیں تبلیغ کی گئی ہے۔
یہ امر انتہائی حیرت کا موجب ہے کہ عین وہ مقامات جہاں
تبلیغ ہو رہی ہے، فرقہ وارانہ کشیدگی سے محفوظ ہیں، اور جن
مقامات پر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوئی ان کو تبلیغ سے دُور کا
بھی واسطہ یا تعلق نہ ہوا! اور اس کے باوجود تبلیغ کو فرقہ وارانہ

کشیدگی کا باعث قرار دیا جائے! ——— میں متوقع ہوں
کہ آئندہ اس کی اصلاح فرمادی جائیگی تاکہ پبلک کو غلط فہمی
نہ ہو۔ افتراپرداز کو فتنہ پردازیوں کے لئے ایک اور موقع نہ ملے،
میں یقین دلاتا ہوں کہ اُسی طرح مذہب اسلام کی تبلیغ نہایت
باقاعدہ اور پُرامن طریقوں پر حدود قانون کے اندر رہ کر کی جا
رہی ہے، جس طرح مذہب عیسائیت کی تبلیغ برسوں سے
جاری ہے۔ مقامی ہندو باشندوں نے کبھی اظہار رنج و غضب
تو کجا، گلہ تک نہیں کیا۔ البتہ کئی مہینے بعد بعض......
پرچارکوں نے ان دیہاتوں میں جاکر لوگوں کو بھڑکانے کی
کوشش کی لیکن تبلیغی کارکنوں کے انتہائی ضبط و نظم نے کوئی
ناگوار صورت پیدا نہ ہونے دی۔ فقط

آپ کا مخلص

بہادر یار جنگ

جب اس قسم کی الجھنیں بھی مرحوم کو اپنے راستہ سے ہٹا نہ سکیں، تو
آریہ سماجیوں کی طرف سے ان کے خلاف اشتہارات چھپوائے گئے اور قصبہ
قصبہ میں تقسیم کیے گئے۔ ان اشتہاروں پر مرحوم کو ایک خونخوار شیر کی شکل
میں ظاہر کیا گیا جو معصوم انسانوں کے خون پر آمادہ ہے، جب اس سے
بھی کچھ بن نہ آئی تو مرحوم کے لئے ایک انعام مقرر کیا گیا، یہ سب کچھ
ہوتا رہا اور مرحوم "حَسْبِیَ اللّٰہُ وَ نِعْمَ الْوَکِیْل" کہہ کر کام
کرتے ہی رہے۔

تبلیغ کے سلسلے میں نہ صرف اغیار کی طرف سے عیبتیں آئیں بلکہ اپنوں نے بھی کافی ستم ڈھائے ——— ایک واقعہ جو مؤلّف ہذا نے خود مرحوم کی زبانی سنا تھا، لکھا جاتا ہے، اسی سے اندازہ لگائیے کہ "نواب بہادر یار جنگ" نے تبلیغی کام میں کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں ——— کسی قصبہ میں مرحوم نے چند اچھوتوں کو مشرف بہ اسلام فرمایا اور وہاں کے مسلمانوں کو تاکید فرما دی کہ آئندہ سے ان کے ساتھ بھی وہی سلوک رہے جو آپس میں ہوتا ہے، سبھوں نے وعدہ کیا اور مرحوم نے دوسرے گاؤں کی راہ لی، کچھ عرصہ بعد پھر پہلے قصبہ میں تشریف لائے تاکہ نومسلموں کی حالت معلوم کر سکیں ——— بہت رنج ہوا جب نومسلم شکایت کرنے لگے کہ اب بھی مسلمانوں کا برتاؤ مساویانہ نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا گیا تھا، مرحوم نے مسلمانوں کو جمع کر کے ڈانٹنا شروع کیا، اِس پر سب کہنے لگے "ہم ان نومسلموں کو برابر تو سمجھیں گے مگر اپنے دسترخوان پر کھانے نہ دیں گے"۔ اِس پر مرحوم کو بہت تکلیف ہوئی، مرحوم نے ان سے کہا کہ "جب تک تم لوگ اِن لوگوں کے ساتھ کھانا نہ کھالیں گے میں ہرگز اس گاؤں سے نہ جاؤں گا اور نہ تمہارا کھانا کھاؤں گا، ——— اِس پر تمام لوگ بغیر کوئی جواب دیئے اپنے اپنے گھر چلے گئے' اور یہ فاروق اعظم کا شیدائی اپنا مختصر سا بستر لئے قریب ہی ایک درخت کے نیچے فاروقی آرام کا لطف اٹھاتا رہا ——— مرحوم فرماتے تھے کہ دو دن اسی طرح درخت کے نیچے گزر گئے، تیسرے روز سب مسلمان آکر معافی چاہنے لگے اور عہد کرلیا کہ آئندہ وہ ان نومسلموں کے ساتھ بالکل اقرباکا سا برتاؤ رکھیں گے، مرحوم کو یقین کیسے ہو سکتا تھا، اس کی تدبیر یہ نکالی کہ کھانا پکوایا اور ایک دسترخوان پر ان لوگوں کو اور نومسلموں کو ساتھ ساتھ بٹھا دیا،

جب دونوں فریق اپنی اپنی رکابیوں میں چاول اور سالن لے چکے تو انھیں اچھی طرح مِلانے کا حکم دیا پھر اِس فریق کی رکابیاں اُس فریق کے سامنے رکھ دیں اور فرمایا کہ "اب کھاؤ" جب انھوں نے بلا تکلف کھا لیا تو وہاں سے واپس ہوئے ———— کیا یہ ایک حیدر آبادی نواب کے احوال ہیں یا اسلام کے ایک سچّے ہیرو کے کارنامے؟ ———— نہ جانے عشق کے اور ایسے کتنے ثبوت دِیے ہوں گے!!

تبلیغ کا کام صرف مسلمان کر دینے سے ختم نہیں ہو جاتا، کیونکہ لبسا اوقات جو کافر، زمرۂ اسلام میں آجاتا ہے، اُس پر معیشت کی راہیں تنگ ہو جاتی ہیں، وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاتا ہے، اس کی حالت اتنی مستحکم کہاں ہوتی ہے کہ ابھی سے آپ اس سے تکلیف میں صبر و شکر اور توکّل کی توقع رکھیں، اس لیے ایسے نومسلموں کے لئے ایک عرصہ تک لباس و غذا فراہم کرنی پڑتی ہے یا پھر ذرائع معاش ڈھونڈنے پڑتے ہیں، ان کے تالیفِ قلب کے لئے رقمی امداد اور ان کے بچّوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے مدارس کا انتظام وغیرہ ایسے لوازمات ہیں جو نظر انداز نہیں کیے جا سکتے ورنہ کیا کرایا کام بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے ———— ایک آدمی کا بھی بار کسی مبلّغ پر اگر پڑ جائے تو حقیقت کھل جاتی ہے، یہاں سینکڑوں نومسلم تھے، مرحوم نے (خدا ان کو اعلیٰ ترین مقامات سے سرفراز فرمائے) اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصّہ ان کے لئے وقف کر رکھا تھا ————،

تبلیغ کے سلسلے میں جیسا کہ اکثر مرحوم فرمایا کرتے تھے، یہ چیز بہت شدّت سے محسوس کی گئی کہ غیر مسلموں کو مسلمان کرنے سے کہیں زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ خود مسلمانوں کو دیندار بنایا جائے ———— مسلمانوں کی

بد دیانتی، وعدہ خلافی، بدکرداری اور ان سب سے زیادہ مذہبی جہل وہ چیزیں ہیں جن سے ان کی وقعت جاتی رہتی ہے اور خود دین بدنام ہو جاتا ہے۔ عوام الناس کو اتنی فرصت اور اتنا ذوق جستجو کہاں کہ وہ اسلامی تعلیمات کو جاننے کی کوشش کریں، ان کے سامنے تو صرف وہ افراد ہیں جو "مسلمان" کا لیبل لگا کر کافری کے کام کرتے ہیں!

مشائخ کی غفلت پر پُرسوز انتباہ

غرض تبلیغ کا کام سراسر مشقت اور ایثارِ ننگ و نام کا طالب ہے، اہلِ حکومت تو اہلِ حکومت، اہلِ خانقاہ بھی جن کے اکابر کا طغرائے امتیاز فقر و فاقہ میں دین کی دلیرانہ منادی دی تھی، اب سراسر فریضۂ تبلیغ سے غافل ہیں۔ ان کی خانقاہوں کی رونق عرس و چراغاں، نذر و نیاز اور قوالی کی دھوم دھام سے رہ گئی ہے، بہادر یار جنگ کو اللہ نے اسلام کا درد اور تبلیغِ دین کا ولولہ بخشا تھا، رسمِ خانقاہی ان کو کیا بھاتی، ان کے ایک "صاحبِ سجادہ" دوست نے ان کو شرکتِ عرس کی دعوت دی، جواب میں مرحوم نے جو کچھ لکھا اس کا حرف حرف ہر مسلمان کے لوحِ دل پر نقش ہو جانا چاہیئے، لکھتے ہیں اور بڑی بے تکلفی اور سوز و درد سے :-

"مجھ رندِ بادہ خوار سے پوچھو، یہ مشیخت تو کچھ تم کو بھاتی نہیں، دنیا کارگہِ عمل ہے، اس کو بھی تم نے عزلت گزینی ہی میں گزار دیا تو اللہ میاں کے سوال کا کیا جواب کہ زندگی میں کیا کر آئے: اللہ حجروں کی چار دیواری کے اندر نہیں، آفاق کے ذرہ ذرہ میں، بیکسوں کی آہ و بکا میں، بے وسیلوں کے نالہ و شیون میں، مظلوموں کی کراہ میں، داد خواہوں کی تڑپ میں، اس کے راستہ میں

رسوائیوں اور ذلّت میں ملے گا، باہر نکلو اور دیکھو، اشرف المخلوقات انسان، حامل بار امانت انسان، خلیفۃ اللہ انسان، کس طرح ذلیل و خوار ہو رہا ہے، اس کی سربلندیوں کا سامان کرو، یہی اصل عبادت، یہی اصل دین ہے.... میری نہیں سنتے تو سعدیؒ کی سنو:۔

طریقت بجز خدمت خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

خدا تم کو اچھا رکھے، اپنی محبت میں ایسا سرشار کرے کہ اس کی کائنات کے چھوٹے سے چھوٹے ذرّہ کی بے قراری تم کو تڑپا دے اور گوشۂ عزلت سے باہر کھینچ نکالے، والسلام"

مکتوب ۲۲۵
۲۴ مئی ۱۹۳۸ء

تبلیغی کام کے چند اہم مشورے

تبلیغ کے اس سہ سالہ دور میں بہادر یار جنگ کو جو تجربے حاصل ہوئے، اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت (آل انڈیا تبلیغِ اسلام کانفرنس منعقدہ بمبئی ۱۹۳۸ء) میں بعض گرانقدر نصیحتیں تحریر فرمائی تھیں جو یہاں نقل کی جاتی ہیں:۔

"دوستو! آپ جانتے ہیں کہ اسلام نے تبلیغ مذہب میں کبھی جبر و اکراہ کو جائز نہیں رکھا۔ قرآن کی زبان اس مسئلہ میں ہر قسم کے ابہام سے پاک ہے (لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ) اور کوئی مسلمان دین کی تبلیغ میں کبھی کسی ایسے فعل کو روا نہیں رکھ

سکتا جس میں مکر، لالچ، جبر اور تشدد کو دخل ہو۔ اس کے باوجود آپ کو اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جب آپ تبلیغ کے میدان میں قدم رکھیں گے تو جن مصیبتوں سے میں گزر چکا ہوں، اور جن مصیبتوں سے بہ اتباع محمد رسُول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) ہر داعی اسلام کو گزرنا چاہیئے وہ آپ کا انتظار کر رہی ہیں، عزم اور صرف عزم، ارادہ اور صرف ارادہ کی پختگی، استقلال اور صرف استقلال آپ کو منزلِ مقصود سے قریب کر سکتا ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ آپ کے قدم ڈگمگا جائیں اور آپ منزل کو پہنچنے سے قبل ہی نہ رُک جائیں۔ آپ کے صاحبانِ ثروت کو چاہیئے کہ اس مبارک ترین کام کے لئے جس کو میں کسی طرح نماز اور روزہ سے کم نہیں سمجھتا، اپنے دستِ کرم کو دراز کریں، آپکے اصحاب دستِ کرم علم وفکر کو چاہیئے کہ اپنی زبان وقلم کو حرکت میں لائیں، آپکے پریس کو چاہیئے کہ اپنے اثرات سے کام لے اور آپکے ہر مرد کو چاہیئے کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح اپنے آپ کو مبلغ اسلام بنائے۔

تبلیغ کے لئے سب سے بڑی دشواری سرمایہ کی کمی ہے جو عین وقت پر دامن پکڑ لیتی ہے اور آگے بڑھنے نہیں دیتی، سرمایہ اس لئے نہیں کہ معاندین کے بزعم خود غلط الزام کے مطابق آپ اس سے کسی کے ضمیر کو خریدیں بلکہ اس لئے کہ مبلغین کا خرچ برداشت کریں۔ قبولیتِ اسلام کے بعد نو مسلمین کی تعلیم وتربیت کا انتظام کریں اور ان پر جو مصائب و آلام آئیں ان سے اِن کی حفاظت کریں۔

تبلیغ کے لئے دوسری اہم ضرورت مخلص، سچے اور صلاحیت یافتہ مبلّغین کی فراہمی ہے، ایک زمانہ تھا کہ ہم میں کا ہر شخص مبلّغ ہوا کرتا تھا، لیکن آج ڈھونڈنے سے ایسے لوگ نہیں ملتے جو تبلیغ کی صحیح صلاحیت رکھتے ہوں۔

تبلیغ کی تیسری ضرورت مسلمانوں کی ہمدردیوں کا حاصل کرنا ہے، جن کو صدیوں کی صحبت و ہمسائگی نے چھوت چھات کے اعتبار سے پورا نہیں تو آدھا ہندو ضرور بنا دیا ہے، آپ کے مبلغین کو چاہیئے کہ غیروں کو مسلمان بنانے سے پہلے ان مسلمانانِ ہند و صفت کو مسلمان بنائیں۔ اپنے تجربہ کی بنار پر میں ایک نصیحت آپ کو کرنا چاہتا ہوں کہ دیہات میں افراد کو مسلمان بنانے کے بجائے کوشش کیجیئے کہ پوری جماعت مسلمان بنے، اس وقت تک چند آمادۂ اسلام افراد کو کلمہ پڑھانے میں دریغ کرنا مناسب ہوگا، جب تک کہ ان کے اثر سے اس گاؤں کے اکثر اچھوت آبادی کو آمادۂ اسلام نہ کر لیا جائے۔

یہ چند اصولی باتیں تھیں جن کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی گئی، ورنہ میدانِ تبلیغ اتنا وسیع ہے کہ ہر روز اس میں نئے تجربوں کی توقع کی جا سکتی ہے"۔

اِس سہ سالہ تبلیغ کے بعد مرحوم راست تبلیغی کام نہ کر سکے مگر اس کام کی طرف سے توجہ کبھی نہیں ہٹائی، مبلّغین کو تنخواہیں بھی دیتے رہے اور ان کے کام کا جائزہ بھی برابر لیتے رہے!!

خاکسار تحریک

"تربیت" کے باب میں لکھا جا چکا ہے کہ بہادر یار جنگ کو بچپن ہی سے فنونِ سپاہ گری سے عشق تھا اور تقریباً ہر فنِ سپاہ گری میں مہارت رکھتے تھے، مرحوم باتوں کے جتنے تیز تھے اس سے کہیں زیادہ عمل کے چست و چالاک تھے، نسلاً سپاہی تھے، اور سپاہیانہ اوصاف ہر مسلمان میں نمایاں دیکھنا چاہتے تھے، ان کی فوجی افتادِ طبع اور سپاہیوں سے اُنس کا اندازہ اسی واقعہ سے لگائیے، مرحوم فرماتے تھے کہ ان کی سیاحت بلادِ اسلامیہ میں صرف دو مقامات ایسے رہے ہیں جہاں پہنچ کر وہ بے اختیار ہو گئے، ایک تو امام فخر الدین رازیؒ کے مزار پر جب پہنچے ہیں اور یہ کتبہ پڑھا۔

"ہفتاد و دو سال درس خوندم شب و روز
معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد"

تو مرحوم پر عجیب کیفیت طاری ہوئی، لیکن دوسرا مقام تو ایسا ہے جہاں پہنچ کر وہ بے قابو ہو گئے، اور غش کھا کر گر پڑے، اور وہ جگہ تھی خواب گاہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، مرحوم فرماتے تھے کہ "بڑی مشکل و تلاش سے میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے مزار پر پہنچا، دیکھا کہ ایک ریگستانی میدان ہے، جس کے قریب بعض پہاڑیاں ہیں، اسی میدان میں اسلام کا جرنیل خالد

بن ولیدؓ آرام فرما ہے، جیسے ہی میرے ذہن میں ان کی معرکہ آرائیوں اور سپاہیانہ تدبّر و فراست کا خیال آیا، میں غش کھا کر مزار پر گر پڑا، اور کچھ دیر تک یہی حالت طاری رہی۔"

مرحوم کی اسلامی فوجی ذہنیت اور اس سے گہرے لگاؤ کا ایک اور ثبوت ان کا حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے غیر معمولی عشق تھا اکثر فرمایا کرتے تھے:-

"کوئی کسی کا قائل ہے کوئی کسی کا قائل ہے، میں تو نظرِ عمرؓ کا گھائل ہوں"۔

اُن کے "نظرِ عمرؓ کا گھائل" ہونے کے پچاسوں ثبوت ان کی زندگی میں ملتے رہے، جب کبھی مرحوم کی زبان مناقبِ عمرؓ پر کھلتی تو تاثر کئی گنا بڑھ جاتا، حق یہ ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد مرحوم کو سب سے زیادہ عشق حضرت عمرؓ ہی سے تھا۔

مرحوم کا خیال تھا کہ منجملہ اور کوتاہیوں اور غفلت شعاریوں کے، مسلمانوں کی سب سے زیادہ غفلت عسکریت ہی کی طرف سے رہی ہے، حالانکہ قوموں کی حیات میں اس کا ایک خاص حصّہ ہے، مختلف تقریروں میں مرحوم نے عسکریت پر زور دیا، چنانچہ اپنے خطبۂ صدارت (مجلسِ اتحاد المسلمین) ۱۳۵۹ھ میں فرمایا:-

"میں نے آپ سے مخاطبت کے کسی موقع کو اس درخواست کے بغیر ختم ہونے نہیں دیا اور آج بھی آپ کی خاص توجہ اس طرف مبذول کرواتا ہوں کہ مسلمان کی زندگی کا نمایاں پہلو عسکریت و سپاہیت ہے۔ جس حیاتِ مقدسؐ کو کائناتِ

ارضی کے سارے انسانوں کے لئے نمونہ بنایا گیا اس پر
اگر آپ کی نظر رہے تو آپ دیکھیں گے کہ ارشاد و ہدایت کے
عظیم الشان فرائض کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ جو پہلو اس
حیات طیبہ میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے، وہ
آقائے دو جہاں (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی عسکریت ہے، ہر
مسلمان اعلائے کلمۃ الحق کے لئے خدا کی فوج کا ایک سپاہی
ہے، اور اگر عہد حاضر کے مسلمان سپاہیت کی طرف سے
غفلت برت رہے ہیں تو یقیناً وہ اپنے رسول کی پیروی
سے غفلت برت رہے ہیں ——— آقائے دو جہاں
(صلّی اللہ علیہ وسلّم) کا متروکہ نہ درہم تھے نہ دینار نہ لونڈیاں
تھیں نہ غلام، نہ املاک تھے نہ تجارت، لیکن امہات المومنین
کے تنگ حجرے اگر آپ کے کسی اثاثہ اور متروکہ سے بھرے
ہوئے تھے تو وہ آپؐ کی تلواریں، آپؐ کی زرہیں، آپؐ کے
خود، اور آپؐ کی کمانیں تھیں ——— میں مسلمانوں
کو اسوۂ حسنہ کے اس پہلو کی طرف بطور خاص متوجہ کرتا
ہوں، میں ان کے ہر ایک فرزند کو خالدؓ و ابو عبیدہؓ کا غلام
دیکھنا چاہتا ہوں" ——— (سیاسی تقاریر ایضاً)

لیکن موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں سے زیادہ اور کوئی نہیں جو اس
اہم فریضہ سے کنارہ کش، اور اس مردانہ وصف سے عاری ہو، مرحوم نے
بارہا اس کے شکوے سنائے :-

"خون کے آنسو رلاتی ہے، وہ نزاکت و نسوانیت جو ہمارے

نوجوانوں میں دِن بدن بڑھتی جارہی ہے" میں "خداوندانِ مکتب" کو آگاہ کردینا چاہتا ہوں کہ ان "شاہیں بچوں" کو "خاکبازی کا درس" دینا ملت کے لئے قبر تیار کرنے کے مترادف ہے جامعہ عثمانیہ ہماری امیدوں کا مرکز ہے، ہماری نگاہیں اس تعلیم گاہ سے فارغ ہونے والوں کے مستقبل پر لگی ہوئی ہیں، لیکن میں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ اس عشرت انگیز اور امیرانہ ماحول سے نکل کر جو دن بدن لم یخلق مثلھا فی البلاد کی شان حاصل کرتا جارہا ہے، ایک نوجوان معاشی زندگی کے مصائب کو کیونکر برداشت کرسکے گا اور اگر ضرورت پڑے تو ملک و ملّت کے لئے بخون و خاک غلطیدن کی رسم کس طرح ادا کرسکے گا۔ اقبالؔ علیہ الرحمۃ کی زبان میں مجھے کہنے دیجیئے :۔

"من آں علم و فراست باپر کاہے نمیگیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را"

غرض نواب صاحب عسکریت کی بڑی اہمیت محسوس کرتے تھے، اور جس طرح ان کے کردار کی خصوصیت تھی کہ کوئی بات اس وقت تک نہ کہتے تھے جب تک کہ خود اس پر عمل پیرا نہ ہوتے یا کم از کم کہہ چکنے پر عمل میں سب سے پیش پیش نہ رہتے تھے، یہی وصف یہاں بھی نمایاں نظر آئے گا۔

خاکسار تحریک

مرحوم کی تبلیغی مساعی سے آریہ سماجیوں اور شدھی سنگٹھنوں کا مذہبی فتنہ تو فرو ہوا مگر وہ لوگ تو دراصل مذہب کی آڑ میں ہندوؤں کی ایک فوج تیار کر رہے تھے تاکہ مسلمانوں

کے رہے سہے اقتدار کو جو ہندوستان میں مسلم ریاستوں کی صورت میں نمایاں تھا ختم کر دیں، چنانچہ ہر جگہ ان کے اکھاڑے اور دنگل قائم ہو رہے تھے اور ویدوں کی بے جان اور رہبانی تعلیم سے ہٹا کر ہندوؤں کو عسکریت کا درس دیا جا رہا تھا، اِدھر یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اُدھر مسلمان جس کو جہاد اور مجاہدانہ زندگی کے قیام کی سخت ترین تاکید اسلام نے کی تھی، وہ سراسر غفلت اور تعطل میں پڑے ہوئے تھے، نواب صاحب نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت مسلمانوں کو مسلّح نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ مسلم اقتدار کے دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں، اتفاقاً اُسی زمانہ میں عنایت اللہ خاں مشرقی کی عسکری تحریک شروع ہوئی۔ مرحوم نے اُسے بڑی امید بھری نظروں سے دیکھا اور خود بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ ضلع ضلع اور گاؤں گاؤں پھر کر خاکسار تحریک کی اشاعت کی، گوشہ گوشہ میں اس کی تنظیمیں قائم کیں اور مسلمانوں کو بتایا:۔

دوستو! دنیا نے نہ کسی فرد نے تکلیف کے بغیر آرام و راحت کی صورت دیکھی ہے نہ کسی قوم نے جس کو تلاشِ راحت ہے اس کو پہلے مبتلائے مصیبت ہونا چاہیئے، حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں:۔ فمن طلب العلی سھر اللیالی اور ہمارا عہدِ حاضر کا شاعر کہتا ہے:۔

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

جن قوموں نے اس رازِ حیات اور سرِّ زندگی کو پہچانا، ان کی رفعت و مرتبت کا پہچاننا دنیا والوں کے لئے مشکل ہو گیا، لیکن جن امتوں نے عالم ذلّت و رسوائی میں بھی شمشیر و سناں

سے بیگانہ ہوکر چنگ و رباب سے دوستی کی وہ دنیا میں کسی کے لئے قابلِ رشک نہیں رہیں، کیا تم کو ان دنوں کے یاد دلانے کی ضرورت ہے جبکہ دو جہاں کے سردار اور صاحبِ لولاک خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین (صلّی اللہ علیہ وسلم) اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بسر کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے جاگتے آپؐ کے قدوم مبارک متورّم ہو جایا کرتے؟ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی جبکہ فاروقِ اعظمؓ میدانِ جنگ سے آنے والے نامہ بر کی تلاش میں مدینہ سے میلوں دُور نکل جایا کرتے تھے؟ کیا تم نے ان دِنوں کو بھلا دیا جبکہ دنیا سے چھوٹے بڑے، امیر و غریب اور عرب و عجم کا فرق مٹانے والا، کفر و ایمان کے درمیان ایک خندق کے ذریعہ حدِ فاصل کھینچ رہا تھا اور اس کے شکمِ اطہر پر پتھر بندھے ہوئے تھے؟ اگر یہ سب تم کو یاد ہے تو پھر مجھے تمھاری اس زحمت پر اظہارِ تاسف و ہمدردی کی ضرورت نہیں جو تم نے برسوں یہاں برداشت کی ہے، زحمت ناآشنائی اور محنت ناشناسی ہی تو ہماری اس نکبت و ذلّت کی ذمہ دار ہے، جس کو محسوس کر کے پھر ایک مرتبہ ہم آمادۂ عمل نظر آتے ہیں، خدا ہمارے ارادوں میں برکت اور ہمتوں میں بلندی عطا کرے۔" (سیاسی تقاریر)

مرحوم نے اس تحریک میں رہ کر رضاکارانہ حیثیت سے وہ وہ کام کئے اور بے نفسی اور اسلام دوستی کے ایسے ایسے ثبوت دیئے جو ایک امیرزادہ اور عیش پروردہ سے تو کیا عام مذہب پرستی کے دعویدار سے بھی ممکن نہیں. خاکی وردی پہنے ہاتھ

ہیں بیلچہ سنبھالے ننگے پیر شاہراہ عام پر یہ امیر ابن امیر بلا تکلف پریڈ کرتا رہا اور یہ بھی ہوا کہ نماز میں تساہل پر کوڑوں اور ڈنڈوں کی سزا بھوبوں کی سیج پر سونیوالا منظر عام پر بلا تامل سہہ گیا۔

گلبرگہ کا واقعہ ہے، حضرت خواجہ گیسو دراز کے عرس کی وجہ سے لاکھوں کا اجتماع ہے، خاکساروں نے اپنا ایک کیمپ قائم کر رکھا ہے، لوگوں کی خدمت میں مصروف ہیں، اپنی فوجی حیثیت سے لوگوں کو متاثر کر رہے ہیں۔ ایک دن پریڈ میں مرحوم چند منٹ دیر سے پہنچے، سالار نے حکم دیا کہ سزا ًٔ (ایک خاص فاصلہ کے) بیس چکر لگائیں، ہزاروں کا مجمع انگشت بدنداں دیکھ رہا تھا کہ یہ جاگیردار بیلچہ کندھے پر رکھے اطاعت امیر کا عملی درس دے رہا ہے اور بلا پس و پیش دوڑیں لگا رہا ہے۔

ایسے ہی اور کئی واقعات عوام نے دیکھے، مرحوم کے خلوص و عمل نے ان کے دلوں میں گھر کرنا شروع کیا اور لوگ اس تحریک کی طرف عملاً بڑھنے لگے، دیکھتے ہی دیکھتے اضلاع اور تعلقوں میں اس کی شاخیں پھیل گئیں اور ایک مضبوط محاذ قائم ہو گیا، اور مرحوم کے قیاس کے مطابق آریہ سماجیوں کے حوصلے پست ہونے لگے اور وہ سہم گئے۔

مشرقی صاحب نے جس وقت تحریک کا آغاز کیا تھا، اس وقت ان کی دیانت، نیک نیتی اور خلوص میں شبہ نہ کیا جا سکتا تھا اور واقعی شبہ تھا بھی نہیں، خود مرحوم نے اس دور کی تقریروں میں ان کے مقاصد و عزائم کی بنا پر ان کو کافی سراہا، مثلاً خاکساروں کی ایک تقریر میں مشرقی کی یوں تائید فرمائی:۔

دوستو: تاریخ عالم کا یہ کھلا ہوا واقعہ ہے کہ دنیا

ہیں جب کبھی کوئی مخلص انسان خدا سے ٹوٹی ہوئی اور ذلّت نصیب قوم کو بلندی اخلاق کا سبق دے کر عزّت وشوکت کے بام عروج پر پہنچانے کا عزم صمیم لے کر نمودار ہوا تو خود غرض افراد قوم نے اس مخلص انسان میں کسی ذاتی عیب کو نہ پاکر ہمیشہ معتقدات ہی کے کمزور ہتھیار سے وار کیا، آج بھی اس مخلص انسان عنایت اللہ خاں مشرقی کے ساتھ یہی کیا جا رہا ہے ——— عنایت اللہ خاں مشرقی نے امیرانہ زندگی پر لات مار کر صرف تین جوڑے معمولی کپڑوں پر زندگی بسر کرنے کا ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص ایسے مستقل ارادے کا نہیں ہے . . . . . .

اختلاف عقاید کا سوال پیدا کرنا محض بے معنی اور لغو ہے' ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کا کلام ہمیشہ محفوظ رہنے والا ہے اور عنایت اللہ خاں مشرقی آج نہیں تو کل مرنے والے ہیں مسلمان کا تعلق تو کسی مرنے والے سے نہیں بلکہ زندہ رہنے والے سے ہوتا ہے۔" (سیاسی تقاریر)

انہی خیالات کے تحت مرحوم ایک عرصہ تک "خاکسار" کی حیثیت سے خدمتِ خلق میں مصروف رہے اور اس وقت بھی جبکہ اتحاد المسلمین میں شرکت فرما چکے تھے اور سرگرمی سے اس کی ترقی میں کوشاں تھے، انھوں نے اس تحریک سے تعلق نہ توڑا، مرحوم چاہتے تھے کہ یہ جماعت اتحاد المسلمین کے تحت رہ کر اس کی عسکری ضرورتوں کو پورا کرتی رہے، لیکن عاقبت نااندیش خاکساروں نے اس کی مخالفت کی ——— حیدر آباد کے خاص

حالات کے تحت مرحوم کا پہلے ہی سے خیال تھا کہ تحریک خاکسار کے اصول میں تھوڑی سی تبدیلی کی جانی چاہیئے لیکن اس میں مرحوم کو کامیابی نہیں ہوئی، اس کی ایک وجہ تو مشرقی صاحب کا یہاں کے حالات کو نظر انداز کر کے اس کی اجازت نہ دینا تھی، اور دوسری وجہ ان حاسدوں کی غلط اطلاعیں تھیں جو مرحوم کے رسوخ کو دیکھ کر ان کے خلاف مشرقی صاحب کے پاس پہنچائی جاتی رہیں، اس واقعہ کا اظہار خود مرحوم نے اپنی ایک تقریر میں جو خاکساروں ہی کے جلسے میں ہوئی تھی اس طرح فرمایا :-

"چند روز پیشتر مجھ میں اور علامۂ مشرقی میں کچھ خفیف سا اختلاف ہو گیا تھا اور وہ محض اِس بنار پر تھا کہ علامہ صاحب نے ہمارے ملک کے مقامی حالات سے ناواقف رہ کر انجمن اتحادالمسلمین کے معاملہ میں دخل دیا تھا، میں انھیں اب بھی غلطی پر سمجھتا ہوں، لیکن اس کی ذمّہ داری بھی ان پر نہیں بلکہ ہمیں کے بعض افراد پر ہے۔" (سیاسی تقاریر)

اِس بجا اختلاف کے باوجود مرحوم اس تحریک کی افادیت کے مدِّنظر اس سے ملحق رہے اور اندرونِ مملکت اور بیرونِ مملکت اس کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، جس کا اعتراف خود قائدِ تحریک کو بھی تھا، چنانچہ اسی بنار پر آخر زمانہ میں وہ سرحد کے سالار بھی مقرر ہوئے تھے!

خاکسار تحریک سے علیحدگی

نواب صاحب نے جس طرح حیدرآباد میں اس تحریک کو مجلس اتحادالمسلمین کے تحت لانے کی کوشش کی، اسی طرح ہندوستان کے لئے بھی یہی مناسب تصوّر فرمایا کہ یہ مسلم لیگ کے تحت رہ کر کام کرے، مرحوم کو اندیشہ تھا کہ دو

الگ الگ مستقل و مستحکم جماعتیں قائم رہنے کی صورت میں اس کا قوی امکان ہے کہ کسی وقت کسی مسئلہ میں بھی آپس میں اختلاف ہو جائے اور مسلمانوں کی وحدت کو شدید جھٹکیں لگے، یہ چیز بالکل صحیح نکلی، اور سب نے دیکھا کہ کتنے معاملات میں مشرقی صاحب نے مصلحت کو نہ سمجھ کر یا محض ضد اور اپنی برطائی کے خیال سے مسلم لیگ اور اس کے صدر کی مخالفت کی، مرحوم کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی، جب انتہائی سمجھانے بجھانے کے باوجود مشرقی صاحب کو "قطب از جانمی جنبد" کا مصداق پایا تو خود ہی اس جماعت سے الگ ہو گئے، اور پھر جو تحریک کی حالت ہو گئی وہ محتاج بیان نہیں۔

مشرقی صاحب کی شدت پسندی اور غلط پالیسی روز بروز بڑھتی گئی، جس کا انتہائی بُرا ثبوت "پاکستان" کی مخالفت، گاندھی جی سے ربط جوڑنے کی کوشش اور قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کی شکل میں ظاہر ہوا، اس انتہا کو دیکھ کر نواب صاحب نے بھی اب مشرقی صاحب کی پورے زور سے مخالفت کی، چنانچہ حادثۂ کشمیر[1] کے بعد جو طویل بیان دیا اس میں اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اب مشرقی صاحب میں قیادت کی صلاحیت باقی نہیں رہی اور وہ خواہ مخواہ اپنی برتری اور ضد کی خاطر مفادِ قومی کو نقصان پہنچا رہے ہیں اگست ۱۹۴۲ء کے اخبارِ مدینہ کے صفحات اس کے شاہد ہیں۔

جماعت رضاکاران

جب خاکساروں کی بنی بنائی منظم جماعت اِس طرح مجلس سے کٹ گئی تو مرحوم نے

---

[1] نواب صاحب مرحوم کو ریاست کشمیر سے راتوں رات ریاست بدر کر کے بیرہ وتار جنگل میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس کی تلافی "جماعت رضا کاران" سے کی، مجلس اتحاد المسلمین کے تحت ہر ضلع، تعلقہ اور قصبہ میں تھوڑی بہت جدید عسکری تعلیم کے مراکز قائم کئے گئے اور نوجوانوں کی تربیت کے انتظامات کئے گئے، اِس طرح ایک حد تک تلافی ہو گئی، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ جماعت خاکسار جماعت کا بدل ثابت نہ ہو سکی۔

ورزشی اکھاڑے

اِس عسکری تنظیم کے ساتھ ساتھ قدیم طرز کے ورزشِ جسمانی کے اکھاڑے بھی قائم کئے گئے، نواب صاحب مرحوم کو ان اکھاڑوں سے خاصی دلچسپی تھی، وہ خود کشتی اور بنوٹ کے خاصے ماہر تھے، اس سلسلہ میں جو اکھاڑا نواب صاحب کی ڈیوڑھی سے قریب قائم تھا اس میں دو تنخواہ یاب پہلوان استاد تھے، جن میں لطف علی پہلوان بنوٹ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ اس ورزش گاہ کی انتظامی کمیٹی کے ارکان ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ خود بہادر یار جنگ ۲۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (حال مقیم فرانس)

۳۔ مولانا عطاء اللہ حسینی ۴۔ مولوی محمود نواز خاں

نواب صاحب کی اِن مساعی کو حکومت نے شبہ کی نظر سے دیکھا اور غالباً محکمہ پولیس سے اس پہ باز پرس ہوئی، نواب صاحب نے جواب میں تفصیل لکھتے ہوئے یہ آخری بات تحریر فرمائی:۔

"اِس ورزش گاہ کے قیام کا مقصد صحت جسمانی اور نوجوانوں میں ورزش کا شوق پیدا کرنا ہے، عام دیسی ورزش کے علاوہ کشتی، بنوٹ اور لٹھ وغیرہ کا کام بھی بطور فنِ حفاظت خود اختیاری سکھایا جاتا ہے"۔

(مکتوب ۱۹ بنام صدر امین کوتوالی
مکاتیب بہادر یار جنگ)

مجلسِ اتّحادُ المسلمین

حالات حکومتِ آصفیہ کیا تھی؟ وہی مغلیہ مسلم اقتدار کے شعلہ کا ٹوٹا ہوا ایک شرارہ، جس کو آصف جاہ اوّلؒ نے نہ معلوم کتنے جتن سے اور کیسی کیسی اُمّیدوں کے ساتھ، شمالی حوادث سے بچاکر دکن میں فروزاں کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کہاں تک ان کی تمنّائیں پوری ہوئیں، اِس کا جواب تاریخ سے اور اپنی فہم سے حاصل کرنا چاہیئے ــــــ

البتہ یہ بات واضح ہے کہ اُدھر اورنگ زیبؒ کو اور یہاں آصف جاہ اوّل کو ہٹاکر دیکھئے تو ایک ہی رنگ اور ایک ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ تختِ شاہی کی نظروں میں ہر مذہب و ملّت کی یکساں حیثیت (بلکہ غیر مذہب اور قوم کا زیادہ پاس ولحاظ) وہاں بھی اور یہاں بھی، مذہب کی محض انفرادی حیثیت وہاں کے بادشاہوں کا بھی شعار اور یہاں کے حکمرانوں کا بھی مسلک پھر نتائج کیوں نہ یکساں ہوتے! مسلمانوں کی چھ سَو سالہ حکمرانی کے باوجود دکن میں سارے معاشی ذرائع کس کے قبضہ میں رہے؟ ملک کی ۸۵ فی صد دیہی آبادی پر عاملانہ اقتدار تمام تر کن کو حاصل رہا؟ معاش اور جائدادوں

کی صورت میں حکومت کے رحم کا پلّہ کن کی طرف جھکا رہا؟ وہی ہندوؤں کی طرف، پھر اگر برسوں ہندوؤں کی گردنیں احسان مندی سے جھکی رہیں تو کونسے تعجّب کی بات ہے؟ لیکن حکومت کو اگر احسان کی "عادت" ہی ہو گئی تھی تو کیا یہ "تسلیم کی خو" کو ہمیشہ ہی اپنا شعار بنائے رکھتے؟ —— جہاندیدہ سعدیؒ نے سچ کہا تھا کہ کھاری زمین ہزار ترکیبوں کے باوجود سنبل نہیں اُگا سکتی۔

زمیں شورہ سنبل بر نیارد ——— درو تخم عمل ضائع مگرداں
نکوئی با بداں کردن چناں است ——— کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

یہی ہوا، ۱۹۲۴ء کے بعد شدھی سنگھٹن اور آریہ سماجی "اکثریتی اقتدار" کے قیام کے عزم سے حیدرآباد آئے، اپنے اس سیاسی مقصد کے حصول کے لئے آڑ مذہبی مناظروں کی لی، ریاست کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ہندوؤں کو اکسایا، مسلمانوں کو مذہبی مغالطہ میں ڈالا، حیدرآبادی ہندوؤں نے حکومتِ آصفیہ کے دیرینہ احسانات کو پسِ پشت ڈال کر سنگھٹنیوں آریہ سماجیوں کا ساتھ دینا شروع کیا ——

پٹا بھی سیتا رامیہ کی "تاریخ کانگریس" خود اس بات کی شاہد ہے کہ ان تحریکوں کا مقصد بجز حصولِ اقتدار کے اور کچھ نہیں تھا۔ پھر یہ بات چھپی کب رہی، بہت سے سنگھٹنی اور آریہ سماجی لیڈروں نے علانیہ زہر اگلنا شروع کیا۔ ایک آریہ سماجی بلدیو نے ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو تقریر کرتے ہوئے کہا:-

"ہندوستان سے مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جانا چاہیئے، ہم عنقریب مسلمانوں کو قتل کر دینے والے ہیں، ہندوستان میں نظام کی ریاست کا وجود نہیں رہنا چاہیئے (اس راج کے اندر) کوئی مسلمان بادشاہ نہیں رہ سکتا، ہمیں چندہ جمع کرنا چاہیئے۔ آپس میں متحد ہو جانا چاہیئے، اور مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈہ

کرنا چاہیے، ہمارا فرض ہے کہ چھ ماہ کے اندر نظام کے تخت پر قبضہ کرلیں"!

(صفحہ ۶، رسالہ آریا سماج)

اغیار کا یہ عالم، اور اپنوں کی یہ کیفیت تھی کہ شیعہ کو سُنّی سے عناد، وہابی کو غیر وہابی سے بغض، صُوفی کو (مراد اصطلاحی) غیر صوفی سے بَیر، عالم و عامی کے اتفاق میں ایک خلیج حائل ــــــ ہر شخص اپنی اپنی جگہ مست، اپنے اپنے ظنِ باطل میں گم، نہ معاش کی خبر نہ سیاست کی فکر، گھر میں چور گھُس چکے لیکن گھر والے بے خبر، فوجیں قلعہ میں داخل ہو چکیں، اور تانا شاہ کے چیلوں کو انفرادی لذتوں سے فرصت ہی نہیں، جمعیت دھاوا بول چکی ہے اور یہ "اجتماعیت" کے معنی سے بے خبر!!

مجلس اتحاد المسلمین کا قیام

اِن حالات میں بعضوں کو فکر ہوئی، مولوی محمود نواز خاں قلعہ دار، حکیم مقصود علی خاں (مقصود جنگ بہادر) مولوی بندہ حسن وغیرہ نے اس سیلاب کے تدارک کے لئے ایک مجلس کی تشکیل دی جس کا نام "اتحاد بین المسلمین" رکھا گیا یہ ۱۳۴۷ھ میں ہوا ــــــ اِس کے مقاصد یہ قرار پائے:۔

۱۔ تمام اسلامی فرقوں کو تحفظِ اسلام کی غرض سے اصولِ اسلام کے تحت متحد کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کے اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی مقاصد کا تحفّظ کرنا۔

۳۔ ملک و مالک کی وفاداری اور قانون مروجہ کا احترام۔

ایک سال بعد اس کا ایک اور اجلاس ہوا جس میں اس کا نام بدل کر "مجلسِ اتحاد المسلمین" کر دیا گیا اور اس کے باقاعدہ قیام کی تاریخ ۴ بہمن ۱۳۳۸ف

دم ۱۹۴۸ء) قرار پائی، یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) کی صدارت میں ہوا تھا۔ اس مجلس کا نام "مجلس اتحاد المسلمین" رکھا گیا۔

مجلس میں نئی رُوح، اور اس کی تشکیلِ جدید

مجلس اتحاد المسلمین قائم تو ہو گئی، مگر اس کا دائرۂ عمل بہت محدود اور طریقہ کار ہمہ گیر نہ تھا۔ دراصل اس کو ایک نہایت فعّال اور مدبّر شخصیت کی ضرورت تھی، ادھر بہادر یار جنگ جواب تک "خاکسار تحریک" سے وابستہ تھے یہ محسوس کر رہے تھے کہ خاکسار تحریک کا دائرۂ عمل تنگ ہے اور ہائی کمان کی عاقبت نااندیشی کی وجہ سے وہ اس کو وسیع بھی نہیں کر سکتے، ریاست کے سیاسی حالات جس سرعت سے بگڑ رہے تھے، ان میں زیادہ تاخیر بھی خطرناک تھی، اس لئے نواب صاحب نے خاکسار تحریک کی طرف سے توجّہ کم کر دی اور مجلس اتحاد المسلمین میں آکر پوری سرگرمی سے کام شروع کر دیا، نواب صاحب کا مجلس میں آنا تھا کہ وہ عوام میں متعارف ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر مقبول ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کو دفعتہً ایسا جگا دیا کہ اغیار کے حوصلے پست ہونے لگے اور حکومت کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ مجلس اتحاد المسلمین مسلمانوں کی واحد سیاسی تنظیم اور اور حیدرآباد میں مسلم اقتدار کی واحد پشت پناہ ہے۔

مجلس اتحاد المسلمین کی ابتدائی گم نامی اور بہادر یار جنگ کی شرکت سے یکایک اس کی شہرت کی وجہ سے عام طور پر نواب صاحب ہی کو "بانیٔ مجلس اتحاد المسلمین" سمجھا جاتا ہے۔

نواب صاحب پہلی بار ۱۹۳۹ء میں مجلس اتحاد المسلمین کے صدر منتخب

ہوئے اور تا آخر حیات مسلمانانِ حیدرآباد کے غیر متزلزل اعتماد کی وجہ سے اِس منصب پر فائز رہے۔

مجلس کے تجدیدی اغراض و مقاصد

"الف" مسلمانانِ مملکتِ آصفیہ کو قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کی طرف متوجّہ کرنا، تاکہ وہ اس حبل اللّٰہ کو مضبوط تھامیں اور کوشش کرنا کہ ملک میں قرآن کی تعلیم کما حقہٗ ہو

(ب) جملہ مسلمان اپنے اپنے مسلک پر قائم رہ کر مذہبی، معاشی، معاشرتی اور دیگر مابہ الاشتراک اور سیاسی امور میں متحد ہوں اور افراط و تفریط سے احتراز کریں۔

(ج) مسلمانان مملکت آصفیہ کی یہ حیثیت ہمیشہ برقرار رہے کہ فرمانروائے ملک کی ذات اور تخت ان ہی کی جماعت کے سیاسی اور تمدّنی اقتدار کا مظہر ہے، اِسی بنا پر مملکت کی ہر دستوری ترمیم میں فرمانروا کے اقتدار شاہانہ کی بقا و احترام مقدم رہے۔

(د) مسلمانانِ مملکتِ آصفیہ کے اِن تمام مفادات و امتیازات و حقوق کو برقرار رکھنا، جو دکن میں ان کو نہ صرف سیاسی اقتدار کی بقا بلکہ معاشی و ثقافتی حیثیت کے تحفّظ کے لئے توارثاً و تعاملاً حاصل رہے ہیں۔

(ھ) کوشش کرنا کہ مسلمانانِ مملکت آصفیہ احکامِ اسلامی کی پابندی کرتے ہوئے غیر مسلم اقوام کے ساتھ رواداری نہ تعلقات کو برقرار رکھیں اور مملکتِ آصفیہ کی وحدت و خود مختاری کا تحفظ کریں[۱]۔"

[۱] تاریخ مجلس اتحاد المسلمین شایع کردہ دارالاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن، مئی ۱۹۴۱ء

مرحوم نے تبلیغ کا کام ہو، یا خاکسار تحریک کی شرکت یا مجلس اتحاد المسلمین کا احیاء، ان میں سے ہر محاذ کو خوب غور و فکر کے بعد قائم کیا تھا، تاکہ مذہبی، عسکری اور سیاسی پہلو سے دشمنوں کو شکست دی جا سکے اور مسلم اقتدار کو نقصان سے بچایا جا سکے، چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء میں خاکسار کیمپ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"مسلمانو! آپ جانتے ہیں کہ اگر ہرن پر گولی چلائی جائے اور ہرن چھلانگ مارتا ہوا نکل جائے تو کوئی نہیں کہے گا کہ نشانہ صحیح بیٹھا، پس صاف دیکھ لو کہ میں نے دو گولیاں چلائی تھیں، ایک تبلیغ کی اور دوسری خاکسار تحریک کی، اِن دو گولیوں نے ہمارے دشمن کو اس بُری طرح تڑپایا کہ ہر بات میں چیخ چیخ کر انہی گولیوں کو کوستا ہے، جب دشمن کو اِن گولیوں سے تڑپتا ہوا دیکھتے ہو تو پھر اس عمل سے تمہاری علیحدگی میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ صحیح گولیاں ہیں، تمھیں بھی اس کا استعمال ضروری ہے تاکہ وہ اور زیادہ تڑپے یا ہمارا ساتھی ہو جائے۔ اب میں نے تیسری گولی اتحاد المسلمین کی چلائی ہے یہ آخری اور زیادہ مؤثر گولی ہے جو اس کو موت کے گھاٹ اُتار رہی ہے، اب اس میں کوئی دم نہیں رہا ہے کہ ہمارے مقابلہ پر آئے

مگر ہاں میں تمھیں صاف بتلا دینا چاہتا ہوں کہ ہر ہندو ہمارا دشمن نہیں ہے، بہت بڑی اکثریت ہماری دوستی پر فخر کرتی ہے، صرف چند اشرار ہیں، اور سب بیرونی اثرات ہیں، اب انشاء اللہ ان سب کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

(سیاسی تقاریر بہادر یار جنگ" شائع کردہ دارالاشاعت سیاسیہ حیدر آباد دکن)

مجلس کا دستور

قائدِ اعظم محمد علی جناح کو نواب صاحب نے جو خط ۱۴-جولائی ۱۹۴۱ء کو لکھا ہے اُس میں مجلس اتحاد المسلمین کے دستور کا اجمالی ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے :-

"میں نے مجلس اتحاد المسلمین کا دستور بالکل لیگ کے دستور کی مطابقت میں بنایا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ لیگ کے سیکرٹری اور خازن کا انتخاب جنرل سیشن کرتا ہے اور میرے کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے پریسیڈنٹ ہی کو یہ اختیار ہے کہ وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبرز کے ساتھ سیکرٹری اور خازن کو بھی نامزد کرے۔"

(مکتوب ۳۱۵ - مکاتیب بہادر یار جنگ)

گویا مجلس کا صدر لیگ کے صدر سے وسیع تر اختیارات کا حامل تھا،

مجلس کا دفتر اولاً "بیت الامّت"

۱۹۳۹ء میں جب نواب صاحب مجلس کے پہلے صدر منتخب ہو گئے اور اب مجلس ایک منظم، قومی اور مسلمانان حیدر آباد کی واحد سیاسی تنظیم کی حیثیت اختیار کر گئی تو اس کے پاس اس کے دفتر کے لئے اپنی کوئی عمارت تھی نہ اُس وقت مالی استحکام اس درجہ کا تھا کہ فوراً کوئی عمارت اس کام کے لئے خریدی یا بنائی جا سکتی - اِس لیئے مجلس کا صدر دفتر نواب صاحب کی ڈیوڑھی ہی پر قائم ہوا، جو "مہدی منزل" کے نام سے شہر حیدر آباد کے محلہ بیگم بپیٹ میں نواب صاحب کے اجداد کے وقت سے مشہور چلی آ رہی تھی، مجلس اتحاد المسلمین کے تعلق سے نواب صاحب مرحوم نے اس کا نام بدل کر "بیت الامت" رکھا اور اس وسیع ڈیوڑھی کو ملت کے لئے وقف کر دیا۔ بیت الامت" کا نام نواب

صاحب کے اخلاص نیت کی وجہ سے ایسا مشہور ہوا کہ بچّہ بچّہ اسی نام سے اس ڈیوڑھی کو جانتا پہچانتا تھا۔

دارالسلام

بہادر یار جنگ کی کامیاب اور قوی الاثر قیادت کی وجہ سے مجلس کے سیاسی توقف کے ساتھ ساتھ اس کی مالی حیثیت بھی بہت جلد مستحکم تر ہو گئی، مجلس کے صدر دفتر کی وسیع تر ضروریات اور مسلمانوں کے موقع بہ موقع اجتماعی جلسوں کے لئے ناف شہر میں نواب صاحب مرحوم نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے ایک قطعہ اراضی جو ۲۴ ہزار ربع گز پر پھیلی ہوئی تھی اور اس میں تین عالیشان پختہ عمارتیں بھی تھیں، مجلس اتحادالمسلمین کے لئے خرید لی۔ اور اس کا نام "دارالسلام" رکھا، اب مجلس کا صدر دفتر "بیت الامّت" سے منتقل ہو کر "دارالسلام" آ گیا! اور مجلس کے سالانہ اجتماعات اور دوسرے غیر معمولی جلسے یہیں ہونے لگے، ــــــــــ "دارالسلام" کا یہ علاقہ مجلس اتحادالمسلمین کے نام وقف رہا۔ سقوط حیدرآباد کے بعد ہند و حکومت نے اس پر قبضہ ناجائز کی کوشش کی مگر مسلمانوں کی اجتماعی قانونی جد و جہد سے یہ وقف بحال رہا۔

مجلس کی تنظیم

مملکت حیدرآباد ۴ چار صوبوں، ۱۶ سولہ ضلعوں اور ایک سو نو تعلقوں میں منقسم تھی، اور ہر تعلقہ میں پھر کئی کئی قصبے اور دیہات تھے، مجلس اتحادالمسلمین کی باضابطہ شاخیں ہر شہر و قصبہ میں قائم تھیں، سال میں ایک مرتبہ خود قائدِ ملت دورہ کر کے ان کی کارکردگی کا جائزہ لیتے تھے، اور دورانِ سال مرکزی مجلس کے اور عہدہ دار بھی وقتاً فوقتاً ذیلی مجالس کا معائنہ کرتے تھے۔

ہر ذیلی و ضمنی شاخ کے لئے بھی تین چار باتوں کا اہتمام لازمی تھا،

(۱) دارالمطالعہ کا قیام (۲) مساجد میں روزانہ کم از کم تین آیاتِ قرآنی کا ترجمہ

سنانے کا بندوبست (۳) ورزش جسمانی کے تربیتی نظام (رضاکارانہ پریڈ اور دلیسی ورزش وغیرہ) کا قیام (۴) ارکانِ مجلس پر نماز باجماعت کی پابندی اور دوسروں کو اس کی رغبت دلانے کی ذمہ داری۔

اس طرح اتحاد المسلمین کی تنظیم نہایت منظم، مستحکم اور حاوی رہی یہانتک کہ حکومت کے ایوان اس سے لرزنے لگے، یہ نواب صاحب کے گرمیٔ کردار، حُسنِ تدبیر اور نیکی و اخلاص کا کرشمہ تھا،

مسئلہ اقتدار اعلیٰ

گو کانگریس ہمیشہ دعویٰ کرتی رہی تھی کہ ریاستی معاملات اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں، لیکن جیسے اور چیزوں میں کانگریس کی مکاری مسلّم تھی، یہاں بھی اسی عیاری سے کام لیا گیا۔ دستور ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے کانگریس کو قوت حاصل ہوئی اور اس نے ریاستوں کے خلاف مہم شروع کر دی، سب سے پہلے ریاستی نظم و نسق پر حملے شروع ہوئے، اس کے بعد اسٹیٹ کانگریس جلوہ گر ہوئی

حیدرآباد میں سر اکبر حیدری قلمدانِ وزارت سنبھالے ہوئے تھے، جن کی حکمت عملی کے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے، بہرحال ان کی بعض تقریروں کی وجہ سے ظاہر ہونے لگا کہ حکومت نے اس آئینِ حکمرانی کو جو اس سلطنت میں صدیوں سے جاری تھا" بدلنے کا ارادہ کر لیا ہے ——— اب کیا تھا کانگریسیوں کی ہمتیں بندھ گئیں، کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے اپنی تمام تر توجہات اس ریاست کی طرف مبذول کر دیں، حیدرآباد کے ہندو زعما بار بار واردھا کے چکّر کاٹنے لگے، گاندھی جی اور ڈاکٹر امبیدکر کے کاد کنوں کی درآمد شروع ہو گئی، مہا سبھائیوں نے فاش طور پر اور کانگریسیوں نے "قومیت" کے پردے میں "ذمہ دارانہ حکومت" کے مطالبے شروع کئے، فرقہ داریت پیدا

کردی اور اندرون و بیرونِ ریاست دولتِ آصفیہ کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا ——— ۱۳۴۸ف سے باضابطہ ستیاگرہ کا آغاز ہوا، قتل و خون کا بازار گرم ہوا، سلطنت کے مختلف گوشوں سے بے گناہ مسلمانوں کے قتل کی خبریں آنے لگیں،

ایسے پُر آشوب اور نازک دَور میں قائدِ ملت نے مجلس کی جو صحیح رہنمائی فرمائی اور جس تدبّر و جرأت سے کام لیا ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے، ایک طرف عوام کو خوابِ غفلت سے چونکایا، دوسری طرف جاگیرداروں کو جھنجوڑا، اور ایک ایسی مضبوط دیوار اٹھائی کہ باطل کی موجیں ٹکرا کر پاش پاش ہوگئیں ——— علامہ سید سلیمان ندوی نے اس کا بہت صحیح نقشہ کھینچا ہے :-

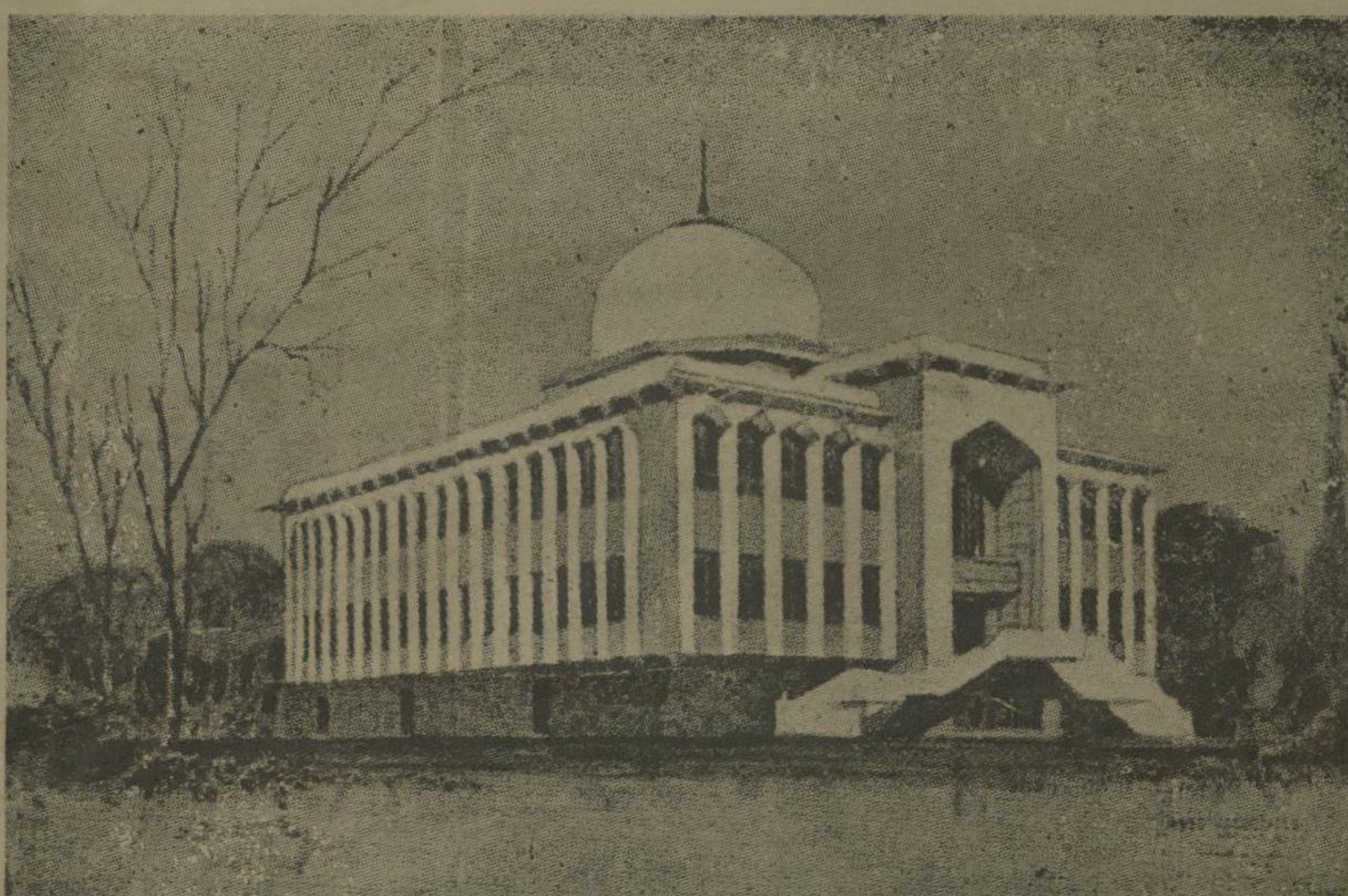
"حیدرآباد میں اگر ان پچھلے چند برسوں کے اندر جب سرحیدری کی سیاست حیدرآباد کے دستور کی ترکیب و تحلیل میں مصروف تھی، نواب بہادر یار جنگ کا وجود نہ ہوتا، تو حیدرآباد کے نظم و نسق کا کچھ اور ہی اندازہ ہوگیا ہوتا، بیرونی ہندو لیڈروں اور دکن کے مرہٹوں نے ریاست کے امن دوست اور وفادار غیر مسلم رعایا کو بھڑکانے میں کوئی کمی نہیں کی، اور یہ دعویٰ کیا کہ مردم شماری کے مطابق ریاست میں دونوں قوموں کے حقوق مانے جائیں، یہ سب کچھ ہوتا رہا مگر اس ملک کے مسلمان بالکل خوابِ غفلت میں تھے اور بجز عیش و آرام ان کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا، وہاں کے مسلمان جاگیردار جو اس ملک کی بڑی قوت ہیں، محوِ استراحت تھے، دکن کے مسلمانوں کی سب سے بڑی

کمزوری یہ ہے کہ وہ صدیوں سے حکومت کے سر پر سارا بوجھ رکھ کر آرام طلبی اور بے فکری کے عادی ہو گئے ہیں، اس بیکاری سے ان کے دست و بازو شل اور قوائے عمل معطّل ہیں، ان کا کوئی قومی اور سیاسی جذبہ زندہ نہیں رہا ہے اور کسی حال میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ان کشورستانوں کی یادگار ہیں، جنھوں نے اپنے کو بڑی مشکلوں میں ڈال کر دکن کی آصفی حکومت کو قائم کیا تھا'

مرحوم کا بڑا کارنامہ اسی جذبہ کو زندہ کرنا تھا، انھوں نے جاگیرداروں کو جھنجوڑ کر جگایا' اور بتایا کہ اگر انھوں نے اُٹھ کر اپنی زندگی اور ملک کو اپنی ضرورت کا یقین نہیں دلایا، تو زمانہ کا سیلاب ان کے اقتدار کو بہالے جائے گا، عام مسلمانوں کو یہ یاد دلایا کہ یہ ملک تمہارا مفتوحہ اور مقبوضہ ملک ہے اور تم بہ حیثیت قوم کے اس کے کشورکشا اور فاتح ہو' اور خانوادۂ آصفی کا سر تاج تمہاری حکومت کا نمائندہ، تمہاری طاقت کا مظہر، تمہاری بادشاہی کا ستون اور تمہاری وفاداری کا مرکز ہے"۔ ——— "معارف" اگست ۱۹۴۴ء

غرض جب کانگریس کی طرف سے مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو مرحوم نے یہ سیاسی کلمہ ہر مسلمان سے پڑھوایا کہ :-

"ہم دکن کے بادشاہ ہیں، اعلیحضرت کا تخت و تاج ہمارے سیاسی اور تمدّنی اقتدار کا مظہر ہے، اعلیحضرت ہماری بادشاہت کی روح ہیں، اور ہم ان کی بادشاہت کا جسم، اگر وہ نہیں تو



زیر تعمیر عمارت بہادر یار جنگ اکادمی

ہم نہیں اور ہم نہیں تو وہ نہیں"۔

(سیاسی تقاریر)

یہ کوئی نیا سبق نہ تھا، مرحوم نے بھولے ہوئے درس کا اعادہ کرایا، لیکن اگر اس نازک موقع پر یہ یاددہانی نہ ہوتی تو اسی وقت ذمہ دارانہ حکومت کا سحر چل گیا ہوتا۔

ملوکیت کی تائید

حیدرآباد میں مسلمانوں کی اقلیت اور ہندوؤں کی اکثریت ناقابلِ انکار حقیقت تھی، ساتھ ہی مسلمانوں کی غفلت اور ان کی معاشی، سیاسی اور تعلیمی زبوں حالی بھی روشن تھی، ایسی حالت میں یہ کوشش کرنا کہ یہاں انتخاب کے ذریعہ مسلمانوں کا فرمانروا مقرر ہو، ایک مہلک اقدام ہوتا، مرحوم اس بات پر سختی سے مُصِر تھے، کہ حیدرآباد کے موجودہ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے "ملوکیت" ہی صحیح ترین طرزِ حکومت ہوسکتی ہے، اپنے اس خیال کی تائید میں مرحوم علامہ جمال الدین افغانیؒ کو پیش فرماتے تھے، ایک مرتبہ جمال الدین افغانیؒ پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"جمہوریت کا وہ شیدائی اور عمومیت کا وہ فدائی جو قاچار کو قتل کرنے کرنے خدیو اسمٰعیل کو ختم کرنے کے منصوبے گانٹھ رہا ہو، اور جس کو دنیا آج بھی شہنشاہیت اور ملوکیت کا دشمن تصوّر کرتی ہو، حیدرآباد آتا ہے اور دو سال حیدرآباد میں رہنا ہے، اس وقت کیا حیدرآباد اپنی موجودہ حالت میں نہ تھا؟ کیا بلارم والوں کی چھاؤنیاں اس وقت انگریزی فوجوں سے خالی تھیں؟ کیا اس وقت حیدرآباد میں انگریزی ریذیڈنسی قائم نہ

ہوئی تھی ؟ اور کیا حیدر آباد میں اس وقت ایک با اقتدار ملوکیت
کام نہیں کر رہی تھی ؟ پھر کیا وجہ ہے کہ شہنشاہیت کا دشمن،
ملوکیت کا قاتل جمال الدین دو سال حیدر آباد میں رہتا ہے اور
اس ملوکیت کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا ——— اس
لئے کہ وہ جانتے تھے کہ جمہوریت یہاں کیا حیثیت اختیار کریگی
اور کس جانب منتقل ہو گی ؟ ——— (سیاسی تقاریر)

یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں ترکی، ایران اور افغانستان اور مصر میں ملوکیت کی تباہی اسلامی جمہوریت کے احیار کا باعث بنی، حیدر آباد میں یہی چیز مسلمانوں کی غلامی اور اسلام کی بیخ کنی کا سبب ہو جاتی[1]۔ اسی لئے مرحوم فرماتے تھے :۔

"حیدر آباد کی ہر دستوری تبدیلی میں مسلمانوں کے لئے دو امور سب سے زیادہ قابلِ لحاظ ہیں، ایک یہ کہ اقتدارات اور وزرا کی ذمہ داریاں کاملاً بادشاہ کے ہاتھ میں محفوظ ہیں یا نہیں ؟ دوسرے یہ کہ قانون ساز جماعت جو بادشاہ اور حکومت کی خدمت میں رعایا کے صحیح جذبات کی ترجمانی، اس کی ضروریات کے اظہار اور حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کے لئے مقرر کی گئی ہے، اس میں مسلمانوں کا مَوقف کافی مضبوط ہے یا نہیں ؟ جب تک یہ دو چیزیں حاصل نہ ہوں مسلمان کسی دستوری تبدیلی کا ساتھ نہیں دے سکتے اور جس لمحہ یہ دونوں مقاصد حاصل ہو جائیں مسلمانوں کو اشتراک

---

[1] جیسے کہ سقوطِ سلطنتِ اسلامی کے بعد جمہوریت کے قیام سے ساری متاع لٹ ہی گئی،

عمل میں عذر نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے"۔
(خطبۂ صدارت جلسہ سالانہ مجلس اتحاد المسلمین ۱۹۴۰ء)

دستوری اِصلاحات

مجلس اتحاد المسلمین کی سہ سالہ زندگی کا سب سے اہم واقعہ دولتِ آصفیہ کے دستوری اصلاحات تھے، جو سر اکبر حیدری کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں ہوئے تھے، اس دستوری اصلاحات کی کمیٹی کے صدر مسٹر آرمور آئینگار ایک مشہور ایڈوکیٹ تھے اور گو اس کمیٹی میں مسلمان ارکان بھی شامل تھے مگر وہ مسلمان وہ تھے جن کو عوام کا نہ اعتماد حاصل تھا نہ وہ مملکت کے مسلم مفاد سے خاطر خواہ دلچسپی رکھتے تھے، ایسی صورت میں ریاست بھر کے مسلمانوں میں تشویش کا پھیل جانا کھُلی ہوئی بات تھی۔

مجلس اتحاد المسلمین نے ۱۳ ر ادی بہشت ۱۳۴۸ ف (م ۱۹۳۸ء) اعلان اصلاحات کو ملتوی کرنے کا ریزولیوشن پاس کیا، مگر جب حکومت نے اس پر کوئی التفات نہیں کیا تو اسی ماہ کی ۱۹ ر تاریخ کو مجلس کے ایک وفد نے صدرِ اعظم سر اکبر حیدری سے مل کر ایک یادداشت پیش کی جس میں مملکت کے سیاسی مؤقف، اسلامی اقتدار کے تحفظ اور مسلم مفادات کی حفاظت پر زور دیا گیا تھا۔

حکومت نے ۱۲ ر شہریور ۱۳۴۸ ف کو اصلاحات کا اعلان کیا، جس میں گو ذمہ دارانہ حکومت کا اعلان نہ تھا مگر ایسی بنیادیں ضرور فراہم کی گئی تھیں جن سے بادشاہت کے بجائے کامل ذمہ دارانہ حکومت (جمہوری نوعیت کی) کی داغ بیل پڑ سکتی تھی —— ان کی تفصیلات میں جانا اب بے سُود ہے۔

ع ایں دفترِ پارینہ غرق مئے ناب اولیٰ

جس کو تفصیل سے دلچسپی ہو، تاریخ "مجلس اتحاد المسلمین" شائع کردہ دارالاشاعت سیاسی مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد دکن اٹھا کر دیکھ لے۔

بہر حال ان اصلاحات سے مہا سبھائی بہت خوش ہوئے، اب مجلس اتحاد المسلمین نے عوام کو ان اصلاحات کے خطرات سے باخبر کرنے کے لئے عام جلسے ریاست بھر میں کئے، خاص شہر میں "قائدِ ملت" نے مسلسل تین دن دارالسلام کے مرکز میں اِن اصلاحات کی توضیح فرمائی اور وہ معرکۃ الآرا تقاریر کیں، جن سے ان کی سیاسی اور قانونی بصیرت مخالفین کو بھی تسلیم کرنا پڑی، اس جلسہ میں جامعہ عثمانیہ کے سارے مسلم طلبہ بطور خاص شامل رہے، اور طلبہ نے مجلس کی تائید میں بھرپور حصّہ لیا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ نواب صاحب نے اس سلسلہ میں ایک وضاحتی یادداشت اعلیٰحضرت کی خدمت میں بھی پیش کی تاکہ وہ اصلاحات کو من وعن منظور نہ کرلیں۔

اس کے بعد مجلس نے حکومت کے خلاف "راست عمل (direct action) کی پوری تیاریاں کرلیں، حکومت گھبرا اٹھی، قائدِ اعظم حکومت کی طرف سے بلائے گئے، اور حکومت نے ان کے ذریعہ مجلس سے مفاہمت کی کوشش کی، اور بالآخر مجلس کی ترمیمات حکومت کو قبول کرنی پڑیں، یہ بہادر یار جنگ کی فراست اور سطوت کی کھلی دلیل تھی۔

اس کے بعد پھر مرحوم کی کرامت یہ ظاہر ہوئی کہ دفعتہً عالمی جنگ چھڑ گئی، (۱۹۳۹ء والی) اور حکومت کو اپنی اصلاحات کا نفاذ ملتوی ہی رکھنا پڑا، اور پھر سر اکبر حیدری کو بھی اپنی کرسی چھوڑنی پڑی اور اُن کی جگہ ایک پکّے اور سچے مسلمان نواب صاحب چھتاری وزیر اعظم بنائے گئے جو بہادر یار جنگ مرحوم سے بڑھی

عقیدت رکھتے تھے۔

مسئلۂ وفاق

لارڈ لنلتھگو (وائسرائے ہند) کے زمانہ میں دیسی ریاستوں سے متعلق سب سے اہم مسئلہ "وفاق" کا تھا۔ وفاق نہ صرف دیسی ریاستوں کے اقتدار کے لئے ایک پیامِ موت تھا، بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتا تھا، کانگریس اسی وجہ سے اس کی پُر زور تائید کر رہی تھی کہ مرکزی حکومت میں اِس کا اقتدار اتنا زیادہ وسیع ہو جائے گا کہ نہ صرف غیر کانگریسی برطانوی صوبے بلکہ تمام دیسی ریاستیں بھی اس کے سایۂ عاطفت سے محروم نہ رہ سکیں گے، اِس طرح ہندوستان کے طول و عرض میں اسی کا ڈنکا بجنے لگے گا، حیدرآباد کے سیاسی اقتدار کے حصول کی جو کوشش مہاسبھا اور آل انڈیا اسٹیٹ کانگریس کے ذریعہ ناکام رہی وہ وفاق کے ذریعہ بہ آسانی پوری ہو سکے گی ــــــــ حکومت حیدرآباد ــــــــ بالفاظِ دیگر "حیدری حکومت" ــــــــ اس طرف کلیتہً جھک چکی تھی اور اگر اس وقت مرحوم نے چپہ چپہ پھر کر، تقریریں کر کے اور نازک ترین حالات کا احساس پیدا کرا کے عوام کو مرکزیت اور استحکام کی دعوت نہ دی ہوتی تو شاید وفاق کے عملی جامہ پہننے میں کوئی دشواری نہ ہوتی، مرحوم نے ان نازک مواقع پر پوری سرفروشی اور جرأت سے کام لے کر نہ صرف مسلمانوں کی بے بہا خدمت انجام دی بلکہ جاگیرداری کا پورا پورا حق ادا کیا، وفاشعاری کا کامل ثبوت بہم پہنچایا اور دوسروں کی آنکھیں کھول دیں۔

حیدرآباد کا معاہداتی مرتبہ

مرحوم اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ حیدرآباد کا موقف دوسری دیسی ریاستوں سے قطعاً جداگانہ ہے، کیونکہ حیدرآباد کے معاہدات حکومتِ ہند

سے نہیں بلکہ براہِ راست تاج برطانیہ سے ہوئے تھے، اور معاہدات کی حیثیت مساویانہ تھی ——— انہی حقائق کی بنا پر وہ اعلیٰحضرت خسرو دکن کو بجا طور پر "ہز اکسلنسی" کی بجائے "ہز میجسٹی" کہتے تھے ——— سنہ ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں تحریر فرماتے ہیں :-

"اِس سلسلہ میں چند اور امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بہی خواہانِ سلطنت آصفیہ نے خصوصاً اور ہندوستان کے سارے مسلمانوں نے عموماً برسوں سے اس تمنّا کو اپنے سینوں میں پرورش کیا ہے، کہ وہ اعلیٰحضرت کے اسم گرامی کے ساتھ "ہز میجسٹی" یا "جلالۃ الملک" کے الفاظ استعمال کریں، اِس کے لئے جس کسی نے کوئی آواز بلند کی تو اس نے اپنے نزدیک غلط طور پر یہ تصوّر کر لیا کہ اعلیٰحضرت کی ذات گرامی اپنے القاب و خطابات کے لئے کسی کی اجازت و عطا کی پابند ہے، میں جہاں تک حیدرآباد کی تاریخ اور اس کے معاہدات پر نظر ڈالتا ہوں اعلیٰحضرت کو اس لقب کے اختیار کرنے میں کسی کی اجازت و رضامندی کا پابند نہیں پاتا، اور کوئی وجہ نہیں سمجھتا کہ مسلمانانِ دکن بلکہ مسلمانانِ ہند آج ہی سے اعلیٰحضرت کو ہز میجسٹی یا جلالۃ الملک کے لقب سے کیوں نہ یاد کریں، بعض مستند روایات کے مطابق آصف جاہ رابع نے اس وقت جبکہ اکبر و عالمگیر کے نسلی و نسبی جانشین تخت دہلی کو زینت دے رہے تھے، اپنے اعلانِ خود مختاری کے باوجود ہز میجسٹی کا لقب اختیار کرنے کو شانِ وفاداری کے خلاف تصوّر کیا تھا، لیکن آج سارے ہندوستان میں اگر کوئی

لفظ اور معنی کی پوری صحت کے ساتھ شہنشاہانِ مغلیہ کی جانشین
اور ہندوستان میں ہز میجسٹی کے لقب کی مستحق ہوسکتی ہے تو وہ
آصفجاہی سلاطین ہی کی ذات ہوسکتی ہے"۔

"جہاں تک ریاست کے حدود کا تعلق ہے، معاہداتی رُو سے اس میں اور بھی وسعت ہوجاتی ہے، یہ علاقے ہیں جو صرف فوجی اخراجات کی پابجائی کے لئے سلاطینِ آصفیہ نے انگریزوں کے سپرد کیئے تھے" ——— اسی لئے جب انگریزوں نے ہندوستان کو مقبوضاتی درجہ دینے کا وعدہ کیا تو مرحوم نے پورے شدومد کے ساتھ اس پر زور دیا کہ حیدرآباد کے علاقے سب سے پہلے واپس کر دئے جائیں، چنانچہ فرمایا :-

"ہماری حلیف سلطنت برطانیہ نے ہندوستان کو مقبوضاتی درجہ دینے کا وعدہ کیا ہے، اس کے صاف الفاظ میں یہ معنی ہیں کہ اس کو وہ حقوق حاصل ہوں جو نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کو حاصل ہیں ——— آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس درجہ کی بنا پر آئرلینڈ شریکِ جنگ نہیں ہے ——— لیکن یہ سب کس کو ملے گا؟ سلطنتِ برطانیہ کے دشمنوں کو! کیا آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے گذشتہ پچاس سال سے برطانیہ کا ناطقہ تنگ کر رکھا ہے، کیا آپ توقع کرسکتے ہیں کہ حیدرآباد کو جو ان کی عزت، ان کی حفاظت کا ضامن اور ہندوستان میں ان کے قیام کا باعث اولین رہا ہے، اپنے معاملات کو آپ طے کرنے کا حق نہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ مدافعت کے جو وعدے ہمارے حلیف نے کیئے، کیا ان کی ضرورت رہے گی؟ نہیں رہے گی! ———

اور جب نہیں رہے گی تو کیا ان مقبوضات کے اپنے حلیف کے قبضے میں رہنے کی ضرورت ہوگی؟ ہرگز نہیں، ہندوستان کو مقبوضاتی درجہ ملنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ علاقے جو اپنی فوجوں کے اخراجات کے لئے تھے ہم کو واپس مل جائیں گے۔

اب جبکہ ہندوستان کے غلاموں کو خود انفصالی معاملات کے حقوق مل جائیں گے تو کیا ہمارے اختیارات حلیف کے پاس باقی رہیں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس کے دوسرے الفاظ میں یہ معنی ہیں کہ ہم کو خود مختاری زیادہ سے زیادہ حاصل ہو جائے گی، ایسی جس کے ذریعہ ہم کو دوسرے دول کے ساتھ تعلقات قائم کرنے اور اپنے دفاع کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

"مملکتِ آصفیہ اسلامیہ کے مقبوضات کی واپسی کے بعد ہمارے حدود اس قسم کے ہوں گے کہ ہم مشرق میں خلیج بنگال پر وضو کریں گے، جنوب میں سلطان شہید کی مزار پر فاتحہ پڑھیں گے اور شمال میں واردھا کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر گاندھی جی کو نمسکار کریں گے، یہ مطالبہ نہیں بلکہ ہمارا حق ہے۔ میں خود مختاری کا اعلان منا رہا ہوں، اور میں اپنی حیثیت کا اعلان کر رہا ہوں اور جس کو ہر مسلمان کے قلب میں جاگزیں ہو جانا چاہیئے" —— (سیاسی تقاریر)

مغالطہ کاری اور تقریر پر پابندی

سیاست کوئی سیدھی سادی ڈگر کا نام نہیں، بلکہ بڑے ہی پیچیدہ اور پُر خطر راستہ کا نام ہے —— بحرِ سیاست کے مدّ و جزر کو وہی ملّاح سمجھ سکتا ہے جس کا تجربہ بہت وسیع ہو جس نے انتہائی مد و جزر میں

کشتی کو بچا کر ساحل تک پہنچانا سیکھا ہو، دور کھڑے دیکھنے والوں بلکہ خود کشتی کے سواروں کو بعض دفعہ ملاح کی ترکیبوں اور چالوں پر شک ہونے لگتا ہے ـــــــ

حیدر آباد کی سیاست میں ۱۹۴۳ء سے قبل کے چار پانچ سال نہایت نازک رہے، اغیار کے پروپیگنڈے، اپنوں کی معصومیت، ایسی چیزیں تھیں کہ اگر بہادر یار جنگ کا سا صاحبِ ہمت و عزیمت قائد نہ ہوتا تو کبھی کا میدانِ سیاست سے بھاگ نکل گیا ہوتا ـــــــ نواب صاحب کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک مہم چلائی گئی، اُن پر بد دیانتی کا الزام لگایا گیا، سیاست سے ناواقفیت کی چوٹیں کسی گئیں اور جب یہ تمام حربے ناکام ہوتے تو ایک آخری اور بڑا ہی خطرناک پروپیگنڈا یہ پھیلایا گیا کہ یہ اعلیحضرت خسرو دکن کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر رہے ہیں، خود خسرو دکن کو بھی مغالطہ دینے کی بھرپور کوشش کی گئی ـــــــ خدا کا کرنا کہ اسی اثناء میں بہادر یار جنگ کی ایک تقریر ہوئی جس کے صداقت پسندانہ جملوں نے اس مغالطہ کاری کو اور بھی تقویت پہنچائی، مرحوم نے مارچ ۱۹۴۳ء کو بمقام ورنگل رسم پرچم کشائی کے موقع پر پوری قوت سے فرمایا:-

"میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ یہ علم چین قلیچ خاں آصف جاہ اوّل یا نواب میر عثمان علی خاں کا نہیں ہے ـــــــ اگر اشخاص کا علم ہے تو میں اس کے واسطے مرنے کو تیار نہیں ہوں، میں اس کو شخصی علم نہیں سمجھتا ـــــــ میرا اور مجلس اتحاد المسلمین کا یہی مسلک ہے کہ یہ اسلامی علم ہے۔"

(رہبرِ دکن ۶ مارچ ۱۹۴۳ء)

بس اب کیا تھا، مخالفین کے ہاتھ گویا ناقابلِ انکار ثبوت آ گیا، نظام کو نواب صاحب کے باغیانہ رجحان کا یقین دلا کر، ان کی تقریر پر پابندی عاید کرا دی۔

تقریر پر پابندی کی اطلاع مرحوم کو ایسے وقت دی گئی، جب وہ ایک کثیر مجمع کو مخاطب کرنے دار السلام جا رہے تھے، مرحوم نے حکومت کے متعلقہ حکام سے اس تقریر کی مہلت حاصل کر لی اور دورانِ تقریر اس پابندی کا ذکر کیا اور پُرسکون رہنے کی تاکید فرمائی۔ سامعین کا عجیب حال تھا کہ حکمِ قائد کے ماتحت خاموش تھے اور دلوں میں غیض و غضب کا طوفان اُٹھ رہا تھا، ایسے میں نظرؔ حیدر آبادی مرحوم نے قائد سے ایک نظم سنانے کی اجازت مانگی۔ اجازت مِل گئی، نظرؔ نے بڑے ہی جوش سے یہ فی البدیہہ شعلہ فشاں نظم پڑھی

"قائدِ ملّت کے نام"

کیا کہا، تو اور پابندی، خدارا رحم کر
دیکھ سینوں میں دھڑکتے دل مچلتے اشکِ تر

رحم فرما رحم اب تاب و تواں باقی نہیں
بیخودی طاری ہے فکرِ دو جہاں باقی نہیں

تیرے صدقے تو نے ہم کو جانے کیا کیا کر دیا
خاک کے ذرّوں کو ہمدوشِ ثریا کر دیا

ساغرِ عیش و مسرّت پی سکیں تیرے بغیر
کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اور جی سکیں تیرے بغیر

تیرے خوابوں کو بروئے کار یوں لائیں گے ہم
تیری خاطر زندگی سے بھی گزر جائیں گے ہم

اب قدم راہِ طلب میں ڈگمگا سکتا نہیں
کوئی طوفاں دِل کی شمعوں کو بجھا سکتا نہیں

جا سُنا دے بجلیوں کو رقص فرمایا کریں
آشیاں پر مسکرا کر آگ برسایا کریں

جا بڑھا دے اور بھی کچھ باد و باراں کا جلال
اب تو وجہِ زندگی ہے جان دینے کا خیال

سُن ذرا اے رازدارِ صبح و شامِ زندگی
دیکھ اپنی قوم کے چہروں کی اب تابندگی

قلبِ عالمگیرؒ کی دھڑکن نہاں رکھتے ہیں ہم
سطوتِ ٹیپو کی تیغِ خوں فشاں رکھتے ہیں ہم

آج بھی دل میں مچلتا ہے وہ جوشِ انقلاب
جس نے سینے پیری بدل ڈالا تھا قوموں کا شباب

دے ہمارے ہاتھ میں ذوقِ جنوں کا ساز دے
اے امیرِ کارواں آواز دے آواز دے

قائدِ ملّت سا غالب حاوی قائد نہ ہوتا تو اسکے بعد مجمع کا قابو میں رہنا محال تھا۔

زبان بندی کے ایک سالہ دور میں بعض معاندینِ قائدِ ملت کو خسروِ دکن کے اکسانے کی امکانی کوشش کی، مگر ۱۹۴۴ء میں جب خاموشی کی مدت ختم ہوئی اور کہنے کا موقع ملا تو دار السلام کے بھرے مجمع میں مرحوم نے یہ اعلان فرمایا:۔

"خوب یاد رکھیں میں اس کا دوست نہیں ہوں جو مسلمانانِ دکن
کے اقتدارِ سیاسی و تمدنی کے مظہر اعلیحضرت شاہ دکن و برار سے
غیر متزلزل وفاداری نہیں رکھتا، میرا ہاتھ اس کی آنکھیں نکال
لیگا، جو اُن کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھے۔ اس کی زبان کھینچ لے گا'
جو اُن کی شان میں ناشائستہ حرکت کا ارادہ کرے
وہ ہماری سیاست کے محور ہیں اور ان کے استحکام و بقا پر ہمارے
استحکام کا انحصار ہے۔"

(رہبرِ دکن، مارچ ۱۹۴۴ء)

بادشاہ پرستی کا الزام

جب ہر چال اُلٹی ہی پڑتی گئی، اور ہر کاٹ غلط ہی نکلی تو اب چند پڑھے لکھے جُہلا، اور چند دوکاندار عالموں نے "بادشاہ پرستی" کا الزام دھرنا شروع کیا، خوب اُچھال اُچھال کر بتایا گیا کہ محمد بہادر خاں دعویٰ تو کرتا ہے اسلامی حکومت کے قیام کا، باتیں تو بگھارتا ہے مرکزیت کے دینی فوائد کی اور حقیقتاً بھٹکا رہا ہے غیر اسلامی راستہ کی طرف۔ "بادشاہ پرستی" کا درس، جو یہ ہر تقریر میں دیا کرتا ہے، ہے کہیں اس کا وجود اسلامی تعلیمات میں ؟ —— پہلا تیر چلایا گیا تھا بادشاہ کو ناراض کرنے کے لئے، یہ کمند پھینکی گئی عوام کو خلاف کرنے کے لئے —— یہ الزام لگایا تو دکن ہی میں لیکن پنجاب کے ایک گوشے سے اس کی تصدیق مزید بھی حاصل کر لی گئی —— قومی مفاد کے اعتبار سے یہ داؤ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا، لیکن اس میں بھی دشمنوں کو وہی ہزیمت اُٹھانی پڑی جو اور حملوں میں اٹھائی تھی،

جس کی تائید پر "ذو القوت المتین" ہو، اسے کوئی کیا نقصان پہنچا سکتا! جس نے آج تک اسلام کی خاطر اپنے روپے کو پانی کی طرح اور اپنے خون کو پسینہ کر کے بہایا، وہ اب "بادشاہ پرستی" کا درس دے گا؟ جس کے پیشِ نظر رضائے الٰہی کا حصول تھا اور جس کی خاطر اس نے آرام و آسائش کو تج کر مصیبت و پریشانی اختیار کی، وہ آج اتنا قبیح جرم کرے گا؟ —— اس نے بہت پہلے ہی اس معاملہ کو صاف کر دیا تھا، اور خفیہ نہیں بلکہ دار السلام میں (۵۰۰۰۰) ہزار کے کثیر اجتماع میں بہ بانگِ دہل جتا دیا تھا، ایک ایک لفظ غور سے پڑھو اور اس مردِ حق کی حقانیت کا اندازہ لگاؤ:-

"یہ نہ سمجھنا کہ میں شاہ دکن کی خاطر مر رہا ہوں اور جان دے رہا ہوں میں عبد الملک نہیں عبد اللہ ہوں، اور دنیا کا کوئی صاحبِ ایمان عبد اللہ کے سوا، اور کچھ نہیں ہوتا۔ میں تخت و تاج آصفی پر اس لئے قربان نہ ہوں گا کہ وہ جلالۃ الملک میر عثمان علی خاں کا تخت و تاج ہے۔ کسی فردِ واحد کے لئے میری قربانی نہ شہادت ہے نہ ایثار، اور نہ خدا کے پاس اس کی کوئی جزا، میں اپنی قربانی کو اور اس کی جزا کو زائل کرنا نہیں چاہتا، یہی وجہ ہے کہ میں تخت و تاج آصفی اور اقتدار شاہانِ آصفیہ پر اس لئے قربان ہونا چاہتا ہوں، کہ میں اس اقتدار کو ملتِ اسلامیہ کے اقتدار کا مظہر تصور کرتا ہوں، اور اقتدار ملتِ اسلامیہ، اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں ہو سکتا، لہٰذا میں حفاظتِ تخت و تاج آصفی اور تحفظ اقتدار شاہی کو تحفظ ملت اسلامیہ و اعلاء کلمۃ الحق سمجھتا ہوں، اور اسی راستہ میں مٹنے کو موت نہیں، بلکہ شہادت اور حیاتِ ابدی

تصور کرتا ہوں۔"

(سیاسی تقاریر قائدِ ملت)

یہ تھی اغیار کے الزام "شاہ پرستی" کی حقیقت ——— کیا حماقت ہے کہ لوگ آفتاب پر خاک اُڑا کر سمجھتے ہیں کہ اس کا نورانی چہرہ گرد آلود ہو جائے گا! حالانکہ سچ تو یہی ہے کہ ان کی اُڑائی ہوئی خاک انہی کی روسیاہی اور انہی کے اندھے پن کا باعث بنے گی ——— یہی ہوا، اور تا قیامت ایسے حالات کا یہی نتیجہ نکلتا رہے گا۔ "حق" ایک کمال ہے اور ہر کمال بغیر ظاہر ہوئے رہ نہیں سکتا

سیاست و مذہب

دینِ اسلام کیا صرف عبادات ہی کا نام ہے معاملات اخلاق اور دوسرے معاشرتی مسائل اس کے دائرہ سے خارج ہیں؟ کیا کسبِ معاش کی راہیں، طرزِ حکمرانی کے ڈھنگ، اور تحفظِ ملت کے اصول کسی اور جگہ سے سیکھے جائیں؟ زوال پذیر قوموں کو سنبھالنے ابھارنے اور بڑھانے کے لئے مغرب کا رُخ کیا جائے؟ ——— ہر سوال کا جواب نفی ہی میں ملے گا ——— اسلام کی اساس قرآن اور سنّتِ رسولؐ ہے اور قرآن، پنڈتوں کے خود ساختہ رسومات کا مجموعہ (وید) نہیں کرشن کی کوئی تقریر (بھگوت گیتا) نہیں، پادریوں کی تحریف کی ہوئی کتاب (انجیل) نہیں، نعوذ باللہ من ذالک، بلکہ یہ ایک نسخہ شافی ہے، اکسیرِ اعظم ہے جس سے انسانیت کے ہر دکھ اور درد کا علاج ہو سکتا ہے، یہ ایک نظامِ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی، مادی و روحانی ہر ہر پہلو کی پرورش کے یکساں سامان مہیا ہیں، نہ عمرانیات کا کوئی مسئلہ اس کی وسعتوں سے خارج، نہ سیاسیات کا کوئی گُر اس کی گہرائیوں میں ناپید ——— پھر دریوزہ گری کی کیا ضرورت اور جب قرآن پورے نظامِ حیات پر حاوی ہے تو سیاست اور مذہب کا فرق کیسا؟ ———

کم فہموں اور بدخواہوں نے محمد بہادر خاں جیسے مردِ مومن کی معاونت سے یہ کہہ کر ہاتھ چھڑائے کہ تم سیاسی ہو، سیاست تمہارا مسلک ہے، ہم مذہب کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ ع

برین عقل و دانش بباید گریست

مغربی سیاست کے گھائل اور اسی میں اپنی فلاح دیکھنے والے ہوں گے، مذہب سے الگ، ہوگی ان کی سیاست مذہب سے جُدا، مگر محمد بہادر خاں تو ایسی سیاست کو "شیطنت" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے، کیونکہ انھیں خوب معلوم تھا۔ ع

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ان کی کونسی گفتگو اور کونسی تقریر ہوتی جس میں مذہبی رنگ غالب نہ ہوتا تھا، مثلاً ۱۳۵۹ھ کے خطبۂ صدارت (مجلس اتحاد المسلمین) کے یہ جملے پیش ہیں :-

"قرآنی تعلیمات کے سوا اور کونسی چیز تھی جس نے ایک بدوی کو تاجِ خسرو اور تختِ کسریٰ کا مستحق بنا دیا تھا، مجلس اتحاد المسلمین ہر اُس سیاست کو جو قرآن کے منبعِ فیض سے سیراب نہیں ہے سُراب سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی، یہی وجہ ہے کہ انتہائی تنظیمی وسعت کے بعد بھی اس نے جو دستور اپنے لئے مرتب کیا ہے اُس میں اپنے وجود کی پہلی غرض اعتصام بحبل اللہ قرار دی۔ زمانہ نے ممکن ہے راستہ میں کچھ تبدیلی کر دی ہو لیکن منزل اگر قرآنی منزل نہیں ہے تو وہ ذلّت و خواری کے جہنّم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ آج میں آپ کے منتخب کردہ خادم

اور اس مجلس کے صدر کی حیثیت سے آپ سب ارکان مجلس اتحاد المسلمین پر عموماً اور ارکان عاملہ وشوریٰ مملکتی مجلس، صدر صاحبان وعہدہ داران مجالس ضلع وابتدائی اور مبلغین مجلس اتحاد المسلمین پر خصوصاً رکنیت مجلس کی شرط اوّلین کے طور پر یہ پابندی عاید کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک عمل کی نیت سے اور معنیٰ ومطلب کو سمجھ کر قرآن مجید کی تین آیتیں روز تلاوت کرے اور اس پر نہ صرف اپنے خدا کو گواہ ٹھیرائے بلکہ ماہواری تختۂ رپورٹ میں جو مملکتی مجلس کو روانہ کیا جاتا ہے، بہ صداقتِ دل اطلاع دے کہ وہ کس حد تک اس شرط کا پابند رہا ہے ——— میرے اِس عمل پر مزاولت نے ثابت کر دیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد آپ پر ثابت ہوگا کہ قرآن کس طرح آپ پر فلاح وصلاح کی انفرادی واجتماعی راہیں کھولتا ہے"۔

(سیاسی تقاریر)

یہی مذہب آمیز سیاست کا رنگ مرحوم نے مسلم لیگ پر چڑھانے کی کوشش کی، مرحوم کی اس صفت کی تصدیق وقت کے بڑے مؤرخ، علّامہ سیّد سلیمان ندوی کی زبانی حاصل کیجیے، خوب غور سے سُنیے کہ کن الفاظ میں تصدیق ہو رہی ہے :۔

"مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا، ان پر دینی سیاست کا راز کھل چکا تھا، اور یہی راز سب کو بتانا چاہتے تھے، اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا تھا، ان کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کراچی کے بعد سے لیگ

کے خالص دنیاوی سیاسیوں پر ان کی تقریر بار ہونے لگی تھی۔"

معارف اگست ۱۹۴۴ء

تصدیق مزید کے لئے ایک اور صاحبِ بصیرت کے ان جملوں کو بھی پڑھ لیجئے :-

"ہندوستان نے اگر دوسرا محمد علی پیدا کیا ہوتا تو وہ یہی تھا، وہی اخلاص، وہی دینی جوش، وہی تڑپ، وہی سوجھ بوجھ، وہی نبض شناسی، وہی ہمت و عزم، بجز محمد علی کی انگریزی انشا پردازی کے سب کچھ وہی؟ ——— لیگ کی مذہبی بے راہ روی کی جب کوئی شکایت سننے میں آتی ("سننا" اس لئے شرکت کا اتفاق بطور تماشائی کے بھی ابھی تک نہیں ہوا) دل کو برابر یہی اطمینان رہتا کہ بہادر یار جنگ جیسے مومن صادق کی ذات دیر سویر انشاء اللہ ہر غلطی کی اصلاح کرائے گی"

(مولانا عبدالماجد دریابادی۔ صدق ۱۹۴۴ء)

آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام

مرحوم کے سیاسی تدبر کا ایک اور اعلیٰ نمونہ، مسلمانانِ ہند کی فلاح کے لئے ان کے تڑپتے ہوئے دل کی ایک اور نشانی، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا قیام ہے، مسلم لیگ کا دائرہ عمل صرف برطانوی صوبہ جات تک محدود تھا، دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی اس کے دائرۂ عمل سے خارج تھی: کانگریس نے بھی اپنے حدودِ عمل برطانوی صوبوں ہی کی حد تک قرار دیئے تھے۔ لیکن اس نے آریہ سماجی اور مہاسبھائی پروپیگنڈے کی شکل میں "نیشنل کانگریس" اور پھر روپ بدل کر "اِسٹیٹ کانگریس" کی صورت میں بہت جلد ریاستوں کے امن کو تہس نہس کرنا شروع کیا تھا ——— ہندو ریاستوں میں مسلمانوں پر مظالم پہلے ہی سے کیا کم تھے، اس یورش کی وجہ سے ان پر اور بھی تباہی آئی۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا، لیکن ریاستی مسلمان کا سہیم و غم خوار کوئی نہ تھا، قائدِ اعظم اور مسلم لیگ بھی ان کی چارہ جوئی سے غافل تھی، حالانکہ ہندو ریاستوں الور، فریدکوٹ، جیند، جے پور، جودھپور، بیکانیر اور میسور وغیرہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی کے جلی عنوانات یہ تھے:۔

۱۔ مسلمان آزادی کے ساتھ اذان دے سکتا تھا، نہ عبادت کر سکتا تھا، نہ

قرآن پڑھ سکتا تھا۔

۲۔ مساجد کو گودام اور اصطبل کے کام میں لایا جا رہا تھا۔

۳۔ مساجد کو مندروں میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔

۴۔ مساجد کو بطور رہائشی مکان ہندوؤں کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ اور مسجدیں نیلام کی جا رہی تھیں۔

۵۔ سڑکیں بنانے کے لئے مساجد اور مسلمانوں کے قبرستانوں کو مسمار کیا جا رہا تھا۔

۶۔ پٹہ کی اراضی پر مسلمانوں کو قبضہ سے محروم رکھا جا رہا تھا۔

۷۔ جنگلات پر جو حقوق ہندوؤں کو حاصل تھے مسلمانوں کو نہ تھے۔

۸۔ بعض ٹیکس ہندوؤں سے کم اور مسلمانوں سے زیادہ لئے جا رہے تھے۔

۹۔ مسلمانوں کی مقبوضی اراضی جب جی چاہے چھین کر ہندوؤں کو دی جاتی تھی۔

۱۰۔ ہندو جج ایک ہی نوعیت کے جرم میں ہندو کو کم اور مسلمان کو زیادہ سخت سزا دیتا تھا۔

۱۱۔ ایسے واقعات پیش آ رہے تھے کہ ہندو عہدہ دار مسلمانوں کو محض جرم اسلام میں گولی کا نشانہ بنا رہے تھے۔

آل انڈیا کانگریس "اسٹیٹ کانگریس" کے نام سے ہندوؤں کی پشت پناہی کر رہی تھی، اِس حالت کو دیکھ کر بہادر یار جنگ کی رُوح تڑپ اُٹھی، ان کے ذہن نے تدبیر سوچ لی، انھوں نے ایک مجلس تشکیل دی، جس میں ہر دیسی ریاست کے مسلم نمائندے طلب کیے گئے، اس مجلس کا کام نہ ستیا گرہ کرنا تھا، نہ بھوک

ہڑتال اور نہ حکومت کے مالی نقصانات کر کے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا، بلکہ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کے جائز حقوق کی حفاظت تھی، تاکہ وہ اپنے تمدن و ثقافت کی ایک حد تک حفاظت کر سکیں ——————"

خود مرحوم نے جنوری ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت (مجلس اتحاد المسلمین) میں اس کا یوں ذکر فرمایا ہے :-

"گزشتہ دو سال کی عرض مدت میں حیدرآباد جس طوفان اور ہنگامہ خیزی سے گزرا ہے، وہ کوئی اتفاق یا حادثہ نہ تھا، کانگریس نے اپنے ابتدائی دور میں اپنے آپ کو برطانوی ہند سے مخصوص اور ہندی ہندوستان سے بے تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی حکومت برطانیہ نے وفاقی مجلس میں ریاستی نمایندوں کا سہارا لیا اور ان کو وفاق کی شرکت پر آمادہ کرنا شروع کیا، یہ سوال پوری شدت کے ساتھ اٹھا کہ ریاستی نمایندے رعایا کے منتخب کردہ ہوں گے، یا رؤسا کے نامزد کردہ ہوں گے اول الذکر صورت کانگریس کے منشار کے مطابق تھی، اس لئے بہ ظاہر اپنے آپ کو بے تعلق رکھ کر کہیں بعض دوسرے مذہبی اور فرقہ وارانہ اداروں کے ذریعہ ——— جیسا کہ حیدرآباد میں ہوا ——— اور کہیں اپنے ذمہ دار ارکان مجلسِ عاملہ کے توسط سے جیسا کہ راجکوٹ اور جے پور میں ہوا ——— رعایائے ریاستہائے ہند کو رؤسا کے خلاف بھڑکانے اور ذمہ دارانہ حکومت کے مطالبہ کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق پامال کرنے کی کوشش کی گئی، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا

گیا بلکہ پٹابھی سیتارامیہ اور جواہر لال جیسے اہم کانگریسی لیڈروں نے اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کی صدارت کی، اس کے کانگریس کے ساتھ الحاق کا تصفیہ کیا، اور ریاستوں کے ساتھ نہایت سخت رویہ اختیار کیا۔ اس کا گزشتہ اجلاس جو لدھیانہ میں ہوا حیدرآباد کے لئے ناقابلِ برداشت طور پر تکلیف دِہ تھا ـــــــــ

دوسری طرف مسلم لیگ ریاستوں سے متعلق اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی پر قائم رہی، اور اس نے کانگریس کی طرح خفیہ اور بالواسطہ طریقے اختیار نہیں کئے، بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بعض موقعوں پر ریاستی مسلمانوں کو مایوس کیا۔ ان تمام حالات نے دیسی ریاستوں کے مسلم باشندوں پر اس ضرورت کو پوری طرح واضح کر دیا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک کل ہند نظام ترتیب دیں ورنہ اکثریت کا اکثریت ہونے کے باوجود بیرونی طاقتوں سے ربط و تعلق اور اقلیت کا اقلیت ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بے تعلق ہونا، ان کے مستقبل کو انتہا درجہ تاریک اور خطرات سے پُر بنا دے گا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوں تو حیدرآباد کے مسلمانوں کو جو مغلیہ شہنشاہیت کی عظمت رفتہ کے صحیح وارث ہیں، سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی شاہراہ ترقی میں رہبری کرنی چاہیئے، لیکن کم از کم وہ اپنے اس فریضہ کی ابتدا دیسی ریاستوں کے مسلمانوں کی قیادت سے کریں۔ اس سے ایک طرف وہ مختلف ریاستوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ اخوت پیدا کر سکیں گے جو ہر ایک کی مضبوطی کا باعث ہوا اور اس کو آنے

والے طوفانِ جمہوریت میں اپنے تحفظ کے قابل بنائے، تو دوسری طرف بالواسطہ وہ برطانوی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ بھی تعاون واشتراکِ عمل کرسکیں گے ——— جے پور، جودھپور اور بعض دوسری ریاستوں کے خونچکاں حالات اور گوالیار و کشمیر وغیرہ کی مسلم کُش دستوری تبدیلیاں اِس ضرورت کو اور بھی زیادہ محسوس کراتی ہیں ———'

چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر ایک "آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ" کی تحریک ریاستی مسلمانوں کے سامنے رکھی اور ان سے خواہش کی کہ ایک مرکز پر مجتمع ہوجائیں اور اپنی انفرادیت کے تحفظ میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں ——— اس ضرورت کو ہندوستان کے اور بھی بہت سے مفکرین محسوس کر رہے تھے، چنانچہ میری دعوت پر ہر طرف سے صدائے "لبیک" بلند ہوئی، میں جانتا ہوں کہ خود حیدرآباد میں میرے لئے اتنا وسیع میدانِ عمل موجود ہے کہ میرے بعض احباب میری اس تحریک کو قبل از وقت اور میری طاقت سے زیادہ تصور کرتے ہیں، لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ کسی کام کا شروع کردینا مشکل ہوتا ہے، جب بیج درخت کی شکل اختیار کرلے تو رفتہ رفتہ اپنی نشو و نما میں باغبان کی توجہ سے بے نیاز ہوجاتا ہے، اور قدرت اس کے لئے سامانِ حیات مہیا کردیتی ہے ——— کتنے ہی ایسے اچھے خیالات ہیں جو انسانی دماغوں کے صندوق میں مقفّل ہیں اور صرف اس لئے دنیا ان کی افادیت سے محروم رہی کہ سوچنے والوں کی

پست ہمتی نے ان کو اظہار سے باز رکھا۔"

آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا مرکزی دفتر ناگپور میں قائم ہوا اور ابتداً اس کا خرچ قائدِ ملّت نے اپنی جیب سے برداشت کیا![۱]

اسٹیٹس مسلم لیگ کے نواب صاحب نہ صرف بانی تھے بلکہ جب تک اُن کی زندگی نے وفا کی، وہی اس کے باتفاق کامل صدر رہے، اور باوجود اتحادالمسلمین کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کے اس کی صدارت کا بھی پورا حق ادا کیا، ریاستی مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور ان کے سیاسی و معاشی حقوق کی بحالی کی پوری جدوجہد کی، جس کا ثبوت مرحوم کے ان مکاتیب سے بھی ملتا ہے جو انھوں نے والیانِ ریاست اور وہاں کے وزرائے اعظم اور تمام سربراوردہ لوگوں کو لکھے ہیں، اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

خواجہ حسن نظامی صاحب دہلویؒ کو ۲۸ فروری ۱۹۳۸ء کے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

"گو میں نے کشمیر میں شیخ عبداللہ صاحب کو، جے پور میں بہلول خاں صاحب دانا کو، میسور میں عبدالجبار خاں صاحب خلیل کو، اور بڑودہ میں مولانا سید مرتضیٰ صاحب کو لکھا ہے اور زحمت دی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے توسط سے ہندو دیسی ریاستوں کے حالات، میں آسانی سے فراہم کرسکتا ہوں۔ ازراہِ کرم تمام مریدین اور وابستگان کو جو کسی ہندو دیسی ریاست میں رہتے ہوں، یا وہاں سے تعلق رکھتے ہوں، بہ تاکید حکم دے کر ان کے نام و پتہ سے مجھے مطلع فرمائیے، کہ وہ ان ریاستوں میں مسلمانوں پر جو مظالم ہوتے ہیں، ان کو مستند تحقیق شدہ اور نہایت قابل اعتماد واقعات

سے حسبِ تفصیل ذیل مجھے مطلع کریں :۔

۱۔ اگر ریاست میں کوئی اسمبلی ہو تو اس میں مسلمانوں کی کتنی نشستیں محفوظ ہیں یا عملاً کتنے مسلمان ارکان ہیں ؟

۲۔ سرکاری ملازمتوں میں علیٰحدہ علیٰحدہ بتائیں کہ وزارتوں، سیکرٹیریٹ اور ہر ایک سر رشتہ میں ہندو مسلم ملازمین کا کیا تناسب ہے ؟

۳۔ مسلمانوں کی مذہبی آزادی متاثر تو نہیں ہو رہی ہے؟ اور اُن پر خاص قسم کے کوئی قیود تو عاید نہیں ہیں ؟

۴۔ ہندوؤں کے ساتھ خاص قسم کے مراعات ہیں کیا ؟

۵۔ اس سلسلہ میں ریاست کی کل آبادی، اُس میں مسلمانوں کا تناسب، مسلمانوں کی عام مالی حالت، اُن کا عام پیشہ، اور اُن میں کسی قسم کی قومی بیداری اور احساس کی نسبت عام معلومات بھی اگر حاصل ہو جائیں تو باعثِ تشکر ہوگا۔

خصوصیت سے مجھے اندور اور مالوہ کے علاقہ کی ریاستوں، پنجاب کی سکھ ریاستوں، راجپوتانہ کی ریاستوں اور ریاست گوالیار کے متعلق معلومات کی ضرورت ہے، جناب کی پوری توجہ اور عاجلانہ توجہ کا متمنی ہوں :۔

آپ کا مخلص"

(مکاتیب بہادر یار جنگ، مکتوب (۳۰))

اِس مکتوب سے بیدار مغز قائد کی ژرف نگاہی کا اندازہ خوب لگایا جا سکتا ہے اور ریاستی مسلمانوں کے تحفّظ حقوق کی جو فکر ان کو دامنگیر تھی وہ بھی عیاں ہے۔

ہندوستان کی ساری ریاستوں کے تفصیلی حالات مختلف ذرائع سے حاصل کر کے قائدِ ملت صدر اسٹیٹس مسلم لیگ نے پھر ان ریاستوں کے اربابِ حل وعقد کو مسلم حقوق کے تحفّظ کی طرف متوجہ کرنا شروع کیا، جس کے ثبوت میں دو تین اقتباسات پیش ہیں :-

مہاراجہ گوالیار کے نام ۲۲ر اگست ۱۹۴۲ء کو یہ مکتوب تحریر فرمایا تھا

ہز ہائینس مہاراجہ گوالیار

یوَر ہائینس !

میں نے آپ کی خدمت میں ایک خط بتاریخ ۱۱ر جولائی ۱۹۴۲ء روانہ کیا تھا، مجھے افسوس ہے کہ اب تک میں اس کے جواب سے محروم ہوں، گوالیار میں کچھ دنوں سے مسلمانوں کو حکومت سے بعض شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں، جن کی نسبت اخبارات میں مسلسل خبریں آرہی ہیں، جب یہ مسائل آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے تو اُس نے مجھ سے خواہش کی کہ اِن مسائل کو مناسب طریقہ پر طے کرنے کی کوشش کروں، اِس زمانہ میں جبکہ جنگ کی وجہ سے عام طور پر ملک میں حالات تشویش کے قابل ہو گئے ہیں اور خود یور ہائینس مساعی جنگ میں مشغول ہیں، مناسب نہیں سمجھتا کہ یور ہائینس کی مسلم رعایا میں بے چینی باقی رہے، اِس لئے متمنّی ہوں کہ یور ہائینس کسی قریبی تاریخ میں مجھے ملاقات کا شرف عطا فرمائیں تاکہ خود حاضر ہو کر ان امور کو آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں، مجھے امید ہے کہ یور ہائینس کسی قریبی تاریخ کا تعین فرما کر مجھے مطلع فرمائیں گے"۔

مکتوب (۳۳۹) مکاتیب بہادر یار جنگ)

سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم جے پور کو ۲۵ نومبر ۴۲ ۱۹ء کو ایک طویل خط تحریر فرمایا ہے، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :-

"آپ کو معلوم ہے اور آپ سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے کہ ان اُن ریاستوں میں جہاں مسلمان انتہائی اقلیت میں ہیں، ان کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے اور رہنا چاہیئے کہ وہ رئیس اور ریاستی حکومت کے ساتھ ممکنہ تعاون و اشتراکِ عمل سے کام کریں اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے صرف CONSTITUTIONL WAY & WEANS (دستوری طریقے) کو اختیار کر کے ریاست کو آمادہ کرنے کی کوشش کریں، یہی پالیسی آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی بھی ہے۔ آپ کا میسور کا تجربہ شاہد ہے کہ وہاں کی اسٹیٹس مسلم لیگ نے کانگریس کی ANTI STATE (خلاف ریاست جدوجہد) سے ہمیشہ اپنے آپ کو الگ رکھا اور ریاست کے ساتھ ہمیشہ تعاون کیا، مجھے یہ سُن کر تعجب ہوا کہ آپ نے جے پور میں مسلم لیگ کے قیام کو ناپسند فرمایا ہے۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کا آل انڈیا مسلم لیگ سے جس کے پریسیڈنٹ مسٹر جناح ہیں کوئی دستوری تعلق نہیں ہے، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ مسلمانانِ ریاست کا ایک بالکل جداگانہ نظام ہے جس کے مقاصد اور اغراض میں نے اوپر بیان کیئے ہیں، اس لئے میں آپ سے متمنی ہوں کہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی فرمائیں، اور مسلمانوں کو مسلم لیگ قائم کر کے منظم ہونے

اور ریاست کے سامنے اپنے جائز مطالبات کو پیش کرنے اور ریاست کے خلاف کانگریس اور ہندو مہاسبھا کی ناجائز مساعی کا ردِ عمل کرنے کا موقع دیں' ـــــــ انشاءاللہ فروری میں جے پور آنے کی کوشش کروں گا۔"

(مکتوب ۳۶۰)[1]

چنانچہ پھر جے پور میں لیگ قائم ہوگئی ـــــــ ایک اور مکتوب (مورخہ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۳ء) میں سر مرزا اسمٰعیل ہی کو تحریر فرماتے ہیں :-

"اِس کے علاوہ مسلمان جائز طور پر برطانوی ہند اور دوسری ریاستوں کی مثال پیش کرتے ہوئے اس مطالبہ کا حق رکھتے ہیں کہ اسمبلی میں نہ صرف ان کی جداگانہ نشستیں محفوظ کی جائیں بلکہ ریاست میں ایک تاریخی اور روایاتی اہمیت رکھنے والی قوم کی حیثیت سے ان کو کم از کم اتنا WEIGHTAGE (وزن) دیا جائے جتنا یُو، پی میں مسلمانوں کو، پنجاب میں سکھوں کو، یا بنگال میں یورو پینیز کو دیا گیا ہے، جو کہ اس وقت کونسٹی ٹیوشن کمیٹی کی رپورٹ میں حکومت کے زیرِ غور ہے، اِس لئے میں اس طرف آپ کی توجّہ کو بطورِ خاص منعطف کرانے کی اجازت چاہتا ہوں"۔

(مکتوب ۳۷۴)[2]

ریاست جودھپور کے مسلمانوں اور عام رعایا کی غذائی امداد کے لئے وزیرِ اعظم

---

[1] و [2] ان دو خطوط کی زبان اور پیرایۂ بیان سر مرزا اسمٰعیل کی رعایت سے انگریزی تحریر کے طرز پر ہے۔ سر مرزا زبان اور وضع قطع میں انگریز اور ذہنی طور پر سخت ہندو پرست تھے۔

پنجاب ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کو مارچ ۱۹۴۳ء میں یہ خط لکھا تھا :۔

"مکرمی! ریاست جودھپور میں اشیائے مایحتاج کی قلت وہاں کی عام رعایا اور خصوصاً غریب مسلمانوں کے لئے بے حد پریشانی کا باعث ہو رہی ہے، وہاں کی اسٹیٹ مسلم لیگ نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ ان کی طرف سے آپ سے درخواست کروں کہ اپنے صوبے سے ان کی ممکنہ امداد فرمائیں ——— مجھے یقین ہے کہ آپ کی توجہ سے ان کی یہ مشکل آسان ہوگی ——— انشاء اللہ دہلی کے آئندہ اجلاس مسلم لیگ میں ملاقات کی مسرت حاصل کروں گا۔" (مکتوب ۳۹۸)

اسی ریاست کے بارے میں حکیم نثار احمد کو جو وہاں کی لیگ کے صدر تھے، ۳ رمئی ۱۹۴۴ء کو یہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"مکرمی! اللہ خاں صاحب کے خطوط سے معلوم ہوا کہ حکومت جودھپور جداگانہ انتخاب دینے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہے ——— تفصیلی حالات سے مطلع فرمائیے کہ اس وقت حکومت جودھپور کا کیا رنگ ہے؟ اور آپ کی گفت وشنید کے کیا نتائج برآمد ہوئے" (مکتوب ۵۸۴)

مارچ ۱۹۴۲ء میں سر اسٹافورڈ کرپس ہندوستان آتے تھے۔ ——— وہ ریاستی نمائندوں سے بھی ملنے والے تھے، بہادر یار جنگ نے اس موقع پر کرپس سے مل کر ریاستی مسلمانوں کے موقف کو پوری طرح واضح کیا، اس سلسلہ میں پہلا خط جو کرپس کو لکھا تھا، اس کا ایک اقتباس ترجمہ شدہ یہ ہے :۔

"سر اسٹافورڈ کرپس،

اخبارات میں، میں نے دیکھا کہ آپ اسٹیٹس کے عوامی نمائندوں سے ملیں گے ________ شاید آپ اِس حقیقت سے واقف ہوں کہ اسٹیٹس کے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی صرف ایک ہی جماعت ہے جو آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کہلاتی ہے اور جس کی نمائندگی مجھے سونپی گئی ہے ____ اسٹیٹس پیپل کانفرنس جو پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں کام کر رہی ہے یا اور کوئی جماعت، اسٹیٹس میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل کو انصاف کے ساتھ پیش نہیں کر سکتی۔

مجھے یقین ہے کہ آپ اسٹیٹس کے مسلمانوں کو نظر انداز نہ کرینگے اور مجھ سے ملنے اور ان مسلمانوں کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے خیال کو پسند کریں گے ________"

(مکتوبات ص ۴۹۳)

اِن چند اقتباسات سے ظاہر ہو چکا ہو گا کہ قائدِ ملّت کی اَن تھک کوشش اور اعلیٰ تدبر سیاسی سے آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ ایک نہایت قوی اور مستحکم ریاستی تنظیم بن گئی تھی اور اب اس کے سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ساتھ عظیم پیمانہ پر ہونے لگے تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کی سالانہ ذمّہ داریوں اور مسلم لیگ کے گہرے علمی اور مشاورتی تعاون کے ساتھ ساتھ اسٹیٹس مسلم لیگ کے فرائض کی اس کمال خوبی سے انجام دہی، یہ قائد مرحوم کی ایک کرامت تھی۔

اعتراض اور شبہ

مرحوم کی اِس تحریک پر ایک اعتراض یہ کیا جانے لگا کہ اِس سے حیدر آباد کی انفرادیت جاتی رہیگی'

حیدر آباد کی تاریخ اور اس کے روایات ایک جداگانہ شان کے حامل ہیں، اِس لئے اس کے اندرونی معاملات میں کسی غیر کی مداخلت ہرگز روا نہیں رکھی جا سکتی، اِس اعتراض کا جو صحیح اور بصیرت افروز جواب مرحوم نے دیا وہ انھیں کی زبانی سنئیے' اس اعتراض کو نقل فرماتے ہوئے جواب شروع ہوا:-

"لیکن گزشتہ دو سو سال میں اندازہ ہوا کہ اپنی انتہائی خوبی کے باوجود یہ نظریہ ہمارے لئے ایک دھوکا ثابت ہو رہا ہے' ——— ہندوستان کے وسیع سمندر میں موجیں اُٹھ رہی ہیں، طوفان آرہے ہیں، سطح مرتفع دکن کی خاک کے ذرّے ان طوفانوں کو خود آگے بڑھ کر دعوت دے رہے ہیں اور کشتیٔ دکن کے نام نہاد ناخدا، اِن طوفانوں کو اُٹھتا ہو کر دیکھ کر لرزہ براندام، حیات سے مایوس اور دام موج کے پہنچنے سے پہلے کشتیٔ حیات کو غرق کر دینے پر مائل نظر آتے ہیں ——— مسافروں کو تھوڑی دور پر چٹان نظر آرہی ہے اور وہ اس پر چڑھ سکتے ہیں، لیکن بیرونی طوفان کو دعوت نامہ لکھنے والا ہاتھ ان کو روکتا ہے۔ کہ خبردار غیر کی اعانت حاصل نہ کرنا ——— میں کہہ چکا ہوں کہ حیدر آباد کی انفرادیت اور استقلال کی تقاضوری ہے، میں آج بھی اس کو اپنے مقصد حیات میں سے ایک سمجھتا ہوں اور کوئی ہرج نہیں سمجھتا کہ اپنی انفرادیت اور استقلال کو مضبوطی سے قائم رکھتے ہوئے وہ دوسروں کی طرف تعاون و اشتراک کا

ہاتھ بڑھائے، یہ امر مجلس اتحاد المسلمین کی پالیسی کے اسی طرح عین
مطابق ہو جاتا ہے کہ مجلس تمام فرقہ ہائے اسلامی کو دعوت
دیتی ہے کہ وہ اپنی اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے جداگانہ
اختلافی عقائد کو باقی رکھتے ہوئے مابہ الاشتراک امور میں دوسری
جماعتوں سے تعاون واشتراکِ عمل کریں، مجھے یقین ہے کہ یہ
تحریک مستقبل میں نہایت کامیاب اور ریاستی مسلمانوں کے تحفظ
ونجات کا ذریعہ بنے گی"۔

ایک اور شبہ پھر پیدا کیا گیا کہ آیا حیدرآباد میں اس کی وجہ سے دو
جماعتیں ساتھ ساتھ رہیں گی (مجلس اتحاد المسلمین اور اسٹیٹ مسلم لیگ) اس
کا جواب مرحوم نے یوں دیا :۔

"حیدرآباد کی مسلمانوں کا ایک ہی واحد اور نمائندہ سیاسی ادارہ
ہے اور اسی حیثیت سے میں نے مجلس اتحاد المسلمین کا تعارف
قائدِ اعظمِ ملتِ اسلامیہ ہندیہ سے بھی کرایا تھا۔ اگر یہ آل انڈیا
نظام کامیاب ثابت ہوا تو مجلس اتحاد المسلمین ہی اپنی ساری
لفظی ومعنوی خصوصیات کے ساتھ اس کی قیادت کرے گی،
اور اس میں وہی مقام حاصل کرے گی جو مملکتِ آصفیہ کو ریاستی
ہندوستان میں حاصل ہے" (سیاسی تقاریر قائدِ ملت)

چنانچہ مرحوم کی ماہرانہ قیادت میں مجلس اتحاد المسلمین اور اسٹیٹس مسلم لیگ
الگ الگ پوری قوت سے کام کرتی رہیں ۔

مُسلم لیگ اور قائدِ اعظم

قائدِ اعظم

مثل مشہور ہے، ''جوہر کی قدر جوہری ہی جانے'' بڑی ہستیوں کے بڑے کاموں کے سمجھنے کے لئے ایک اعلیٰ دل و دماغ کی ضرورت ہے ——— مرحوم کی نگاہ میں نہ صرف ہندوستان کے مسلمان اور ان کے مختلف رہنما تھے، بلکہ کل بلادِ اسلامیہ کے مسلمان اور ان کے لیڈروں کی حالت و استعداد تھی ——— مرحوم کی نگاہوں نے ہندی مسلمانوں کے لئے قائدِ اعظم محمد علی جناح سے زیادہ بے لوث، بے ریا، پرخلوص اور ماہرِ فن قائد کسی کو نہ پایا، مسٹر جناح کی اعلیٰ دماغی صلاحیتوں اور ان کے تدبر و فکر نے نواب صاحب کا دل موہ لیا تھا ——— مرحوم کا خیال تھا (اور کس کو اس سے انکار کی مجال ہے) کہ قائدِ اعظم سے بڑھ کر گاندھی کے بدلتے ہوئے پینتروں کو سمجھنے والا، حکومت برطانیہ کی چال بازیوں اور مکر سامانیوں کو تاڑ لینے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا ——— میں نے دیکھا ہے اور جن لوگوں نے بھی قائدِ ملت کو قائدِ اعظم سے ملتے دیکھا ہوگا وہ اس بات کی تصدیق کریں گے، کہ قائدِ اعظم کو دیکھتے ہی مرحوم کی رگ رگ میں فرحت و انبساط کی ایک لہر دوڑ جاتی، اور چہرہ جو قلب و دماغ کا سب سے بڑا آئینہ ہوتا ہے، یکایک دمک اٹھتا تھا

_____ نواب صاحب قائدِ اعظم سے اِس طرح ملتے تھے جیسے کہ ایک معمولی رضا کار' اپنے سپہ سالار سے ملے' اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قائدِ اعظم کا اتنا پُر خلوص، قابلِ اعتماد اور جانباز سپاہی کوئی اور نہ تھا _____ وہ قائدِ اعظم جن کی زبان اپنے ساتھیوں اور ملت کے خادموں کی تعریف میں کبھی نہیں کھلتی تھی بہادر یار جنگ کی تعریف و تحسین میں یوں دُرفشاں ہوتی ہے :-

اعلیحضرت حضور نظام کی رعایا کی حیثیت سے اگرچہ نواب بہادر یار جنگ کا کوئی دستوری تعلق مسلم لیگ سے نہیں، لیکن بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین اور رہبر ثابت ہوئے ہیں، نواب صاحب نے مسلمانانِ حیدرآباد کی تنظیم میں اپنی جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ ہم سب کے لئے باعث فخر و مسرّت ہے _____ خدا انھیں عمر دراز عطا کرے۔ آمین _____"

یہ اظہارِ حقیقت مرحوم کی حیات میں ہوا، جب رحلت فرما گئے تو قائدِ اعظم وفورِ غم سے بیخود ہو گئے، جب سنبھلے تو صرف اتنا فرمایا :-

"وہ ایک مسلمان تھے قلب و روح کی مسلمانی کے ساتھ"!

اور یہ بھی سُنا ہے کہ جب لیگ کی عاملہ میں قراردادِ تعزیت پیش ہو رہی تھی تو قائدِ اعظم کے ضبط کا جام پُر ہو چکا تھا، اور حسرت آمیز محبّت کی شراب ساغرِ چشم سے چھلک چھلک جا رہی تھی _____ قائدِ اعظم کی یہ کیفیت عمر میں صرف دو بار دیکھی گئی _____ ایک بار مولانا محمد علی جوہرؒ کی وفات پر، دوسرے اِس مردِ مومن کی رحلت پر۔

بہادر یار جنگ کو بھی مسٹر جناح کی ذات سے ایسی ہی عقیدت و محبّت

تھی، ـــــــ رات کے بارہ بجے ہیں، مرحوم اپنے کام میں مصروف ہیں (کیونکہ بارہ، ایک بجے سے قبل سونے کی مہلت کہاں ملتی تھی) مجلس اتحاد المسلمین کے ایک پُر خلوص کارکن مولوی حبیب محمد خاں صاحب بھی موجود ہیں، یونائیٹڈ پریس سے ایک تہلکہ انگیز خبر آئی، معلوم ہوا کہ کسی بدنیت نے قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ جناح بچ گئے ـــــــ یہ خبر پڑھتے ہی دل و دماغ پر رنج و غصہ اور ساتھ ہی شکر و اِمتنان کی متضاد کیفیات چھاگئیں، آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے، دیکھتے ہی دیکھتے سِسکیاں بندھ گئیں، جب گھنٹہ بھر برس کر مطلع کچھ چھٹ گیا تو فرمانے لگے :۔

"خاں صاحب آپ کیا جانیں قائدِ اعظم کو، ہمیں معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں ـــــــ اگر آج خدا نخواستہ کچھ ہو جاتا تو ملّتِ اسلامیہ ہند کی کشتی کو سنبھالنے والا تھا بھی کوئی اور؟"

اس کے بعد پھر رونے لگے ـــــــ رات اسی طرح کٹی، صبح ہوئی تو پہلی ٹرین سے بمبئی چل پڑے ـــــــ یہ تھا محبت کا عالم! ـــــــ!

کتنی دفعہ مرحوم نے اپنے ملنے جلنے والوں کے سامنے اس اَمر کا اظہار کیا کہ :۔

"اگر میری دعا مقبول ہوتی تو میں التجا کرتا کہ اے اللہ تو میری عمر کو گھٹا کر قائدِ اعظم کو عمرِ طویل عطا فرما"

اِس محبت کے باوجود اعتدالِ فکر و مزاج کی بنا پر مرحوم فرماتے تھے،

کہ مسٹر جناح پلیٹ فارم کے لیڈر ہیں، میدانِ عمل میں اُتر آنا اُن کے لئے ممکن نہیں، اُن کا اسی مقام پر رہ کر کام کرنا زیادہ اولیٰ ہے اور اسی طرح وہ ملّت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔"

مرحوم کا ایقان تھا کہ اس وقت کے حالات کے تحت قائدِ اعظم ہی ہندی مسلمانوں کے قائد ہو سکتے، وہ چاہتے تھے کہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ لیگ کی مرکزیت کے تحت اپنے اپنے اصلاحی امور انجام دیں،

قائدِ اعظم پر سب سے بڑا حملہ اُن کے مغرب زدہ ظاہر پر کیا جاتا تھا، اس کا جواب مرحوم نے راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے (جب کہ وہ کشمیر سے نکالے گئے تھے) یہ دیا تھا:۔

پہلے مسٹر جناح کی قابلیت اور قائدانہ صلاحیتوں کو بہت سراہا پھر فرمایا:۔

"مجھے رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں فرمایا گیا کہ مسلمانوں پر ایک وقت آئے گا جب کہ فاسق و فاجر اُٹھ کر اُن کی رہنمائی کریں گے، میں جناح کو اچھّی طرح جانتا ہوں، کیونکہ مجھے ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا ہے وہ افرنگ زدہ مغربیت میں رنگے ہوئے ہیں، مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث[1] کی صداقت پر اب پورا یقین ہو چکا اور اس وقت کے مسلمانوں کی حالت اس کی پوری طرح تائید کر رہی ہے۔" (مدینہ ۵ ستمبر ۱۹۴۳ء)

---

[1] اِنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھٰذَا الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ۔"

مرحوم فرماتے تھے کہ "میری اس تقریر کو بڑے بڑے مسلم لیگیوں نے قائدِ اعظم کے خلاف سمجھا، اور مجھ سے استفسارات شروع ہوئے، میں نے ہر ایک کو یہی جواب دیا کہ "ذرا غور تو کرو، میں نے تائید کی ہے نہ کہ مخالفت"۔

مسلم لیگ سے تعلق

قائدِ ملت نے اللہ کی بے پناہ عنایتوں اور بخششوں کو بے دریغ لٹایا، دولت لٹائی راحت و آرام نثار کیا جسمانی قوتیں صرف کر دیں، دماغی صلاحیتیں وقف کر دیں ——— تڑپتے رہے تڑپاتے رہے، جہاں سرد پائی حرارت کی لہر دوڑا دی، جہاں چنگاریاں نظر آئیں ان کو بھڑکا دیا، بس جلنا جلانا ہی ان کا مقصدِ زندگی تھا، یہ مشرب کسی کو محدود و مقید کیسے رکھ سکتا ہے؟ ہر تحدید جذبۂ خدمت کے سیلاب سے مٹتی گئی ——— صدر مجلس اتحاد المسلمین دیکھتے ہی دیکھتے صدر آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ اور پھر خود آل انڈیا مسلم لیگ کے قائدین میں سے سمجھا جانے لگا، بلا کی کشش اور غضب کی جاذبیت تھی، تقریر ہی نہیں خود ذات میں عمل میں، فہم میں تدبر میں اور مخالفوں کو اپنانے میں۔ جو ایک دفعہ اُن سے قریب ہوتا وہ اُن سے چمٹ جاتا، ان پر فریفتہ ہو جاتا۔

مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر آتے ہی مرحوم کا وہ رنگ جما کہ اوروں کا رنگ مدھم پڑ گیا، اپنے اس اثر سے قائدِ مرحوم نے قائدِ اعظم کے بڑے بڑے کام انجام دیئے ——— سرحد میں سرحدی گاندھی (عبد الغفار خاں) کا سحر کس نے توڑا؟ جنوب میں راس کماری تک مسلم لیگ کا ڈنکا کس نے بجایا؟ لاہور کا وہ تاریخی جلسہ جس میں تحریک پاکستان پیش ہوئی کس کی وجہ سے ہو سکا؟ ——— خاکساروں کی شورش سے حکومت نے مسلمانوں کے اجتماع کی ممانعت کر دی تھی، مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کے تمام انتظامات ہو چکے

تھے اور قائدِ اعظم دہلی پہنچ چکے تھے، لیکن یکایک اِس امتناعی حکم کی وجہ سے سارے عزائم ملیامیٹ ہوتے جا رہے تھے، ایسے وقت میں بہادر یار جنگ نے قائدِ اعظم کو یقین دلایا کہ جلسہ ہو کر رہے گا اور ڈسپلن (نظم وضبط) کا ذمہ دار میں ہوں! آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے حکومت پر اس امر کا اظہار فرما دیجیے' کہ وہ جلسہ کی اجازت دیدے، نظم وضبط اور امن وسکون کا ذمہ دار میں (یعنی قائدِ اعظم) ہوں"۔ قائدِ اعظم نے اپنے پُرخلوص اور حوصلہ مند ساتھی پر کامل اعتماد کرتے ہوئے اور اس کی قوت بازو کو محسوس کرتے ہوئے حکومت سے اپنی ذاتی ضمانت پر جلسہ کے انعقاد کا مطالبہ کیا، حکومت نے منظور کر لیا، مسلم لیگ کا صدر اور دیگر عہدہ دار لاہور پہنچے، قائدِ ملت نے خاکساروں میں دو تین ایسی اثر آفرین اور بصیرت افروز تقریریں کیں کہ ان کا بے جا جوش سب ٹھنڈا ہو گیا، اور جس شان وشوکت اور امن وسکون کے ساتھ لیگ کا یہ تاریخی اجلاس اختتام کو پہنچا وہ اظہر من الشمس تھا۔

علاوہ ازیں لیگ کے عہدہ دار و عوام میں ذہنی انقلاب کس نے پیدا کیا؟ مذہب کی وقعت و عظمت کا سکہ سب کے دِلوں پر کس نے بٹھایا؟ قرآن اور سیرتِ طیبہ کے مطالعہ کا ذوق کس نے پیدا کیا، کراچی (دسمبر ۱۹۴۳ء) کے یادگار سالانہ جلسہ میں کس کی زبان حقیقت ترجمان یہ سُنا رہی تھی اور جتا رہی تھی کہ :-

سُن لو اور آگاہ ہو جاؤ کہ جس سیاست کی بنیاد کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ پر نہیں ہے وہ شیطانی سیاست ہے ——

میرے دوست جسمانی ناپاکی دُور ہو سکتی ہے لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی و گندگی ہے جس کو دھونے کے لئے خدا نے

انبیاء جیسی ہستیاں پیدا کی تھیں، کیا ان ناپاکیوں کا مرکز بن کر جھوٹ کو اپنا روزمرہ کا شعار بنا کر مکر و فریب میں مبتلا رہ کر ظلم و استبداد کو جاری رکھ کر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں؟ اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے اور ہمیں ہندوستان کے دونوں شمالی گوشوں میں خود مختار حکومتیں مل بھی گئیں تو کیا وہ پاکستان کہلانے کی مستحق ہوں گی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور یاد رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے ——— مکر و زور کی سیاست، طالبان پاکستان کی سیاست نہیں ہو سکتی، آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج سے پاک کرنا شروع کرے، مگر آہ! یہ ایک حقیقت ہے کہ سپاہی اس وقت تک پاک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہو جائے ——— سُن لو اور یاد رکھو! اسلام کے عہد آخر کا سب سے بڑا مفکر کیا کہہ رہا ہے :- ؎

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی طبیعت میں بوئے اسد اللّٰہی

اور ڈائس پر بیٹھنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر :-

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لیگ کے عوام اور نرے سیاسیوں کو مذہب کی بے خمار شراب کے جام کے جام پلا کر اور ان کی محفلوں میں اس کے خم کے خم لنڈھا کر، ترکی کی راہ اختیار کرنے والوں کو مکہ مدینہ کی طرف پھیر دینا کوئی چھوٹا احسان ہے ؟

مرحوم رعایا یار حیدرآباد سے ہونے کے سبب، لیگ کے رکن نہ تھے، اور نہ جلسوں کے وقت اس کی کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے، لیکن لیگیوں میں غیر سرکاری طور پر شعور پیدا کرنے اور ان میں عزم و یقین کو راسخ کرنے اور حصولِ پاکستان کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کا ولولہ مرحوم ہی پیدا فرمایا کرتے تھے، اور سب کو تیار کر کے لیگ کے تاریخی جلسوں میں لاتے اور خود تماشائی بنکر پورے جلسہ کی کارروائی دیکھتے اور جب پوری کارروائی ختم ہو جاتی، اور قانونی حیثیت سے جلسہ برخاست ہو جاتا تو قائدِ اعظم کے حکم سے خود اجلاسِ عام کو مخاطب کرتے تھے ——— لیکن عوام کے لئے تو کارروائی کا اختتام ہی جلسہ کا آغاز ہوتا تھا ——— آدھ پون گھنٹہ نہیں تین تین گھنٹہ تقریر ہوتی اور مجمع میں سے کوئی شخص انگڑائی تک نہ لیتا، تاثیر کا وہ دریا بہتا کہ لوگ مرحوم کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان بن جاتے ——— یہی وجہ تھی کہ جب مرحوم نے لیگ کی "دس لاکھ کی اپیل" کے سلسلے میں مسلمانوں کو جھنجوڑنا شروع کیا تو ایک گھنٹہ کے اندر (الہ آباد کے سالانہ جلسہ میں) ہزاروں روپیہ نقد، ہزاروں کے وعدے اور زیورات کا ڈھیر لگ گیا۔ یہی کیفیت کراچی کے جلسہ میں بھی دیکھی گئی ——— اِسی طرح دہلی کے سالانہ جلسہ میں قائدِ اعظم نے نواب صاحب مرحوم سے فرمایا۔ "میرا خیال ہے کہ

اِس جلسہ کے اخراجات، جس کا تخمینہ ایک لاکھ ہے، اسی جلسہ سے پورے ہو جائیں، میں نے اپیل کی تھی لیکن اب تک صرف چند ہزار جمع ہوئے ہیں" —— جلسہ کا آخری روز ہے، کارروائی ختم ہو چکی، برخاست کا اعلان ہو چکا، لوگ بجائے اٹھنے کے سنبھل کر بیٹھنے لگے، اشتیاق سے ڈائس کی طرف نظریں اُٹھنے لگیں، کس کا انتظار ہے؟ وہی قائدِ ملّت کا! ۔ قائدِ اعظم نے اعلان کیا کہ "اب نواب صاحب تقریر فرمائیں گے"۔ مسرّت و حیات کی ایک لہر دوڑ گئی ——

قائدِ اعظم پہلے ہی اشارہ کر چکے تھے، پاکستان کی اہمیت و افادیت پر گفتگو ختم ہوئی اور نواب صاحب نے مسلمانوں کی عملی کمزوریوں کا شمار شروع کیا اور یہ فرمایا کہ جو "مال کا ایثار نہیں کر سکتے وہ جان کیا دے سکیں گے" یہ سننا ہی تھا کہ روپوں اور چیزوں کی بارش ہونے لگی، قائدِ اعظم نے اعلان فرمایا کہ "میں صرف نقد لوں گا" —— صبح جب حساب لگایا تو سوا لاکھ رقم وصول ہو چکی تھی۔

زعمائے لیگ کی اپنے مقصد سے بے اعتمادی

پُونا میں مرکزی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا (غالباً ۱۹۴۰ء میں) نواب صاحب مرحوم اس اجلاس میں شریک رہے، جب حیدرآباد آئے تو دوسرے دن راقم الحروف سے بہ صد حسرت فرمایا کہ جس جماعت کے زعماء میں اپنے مقصد سے قوی لگاؤ اور اعتماد نہ ہو وہ جماعت اپنے عزم میں کیسے کامیاب ہو سکتی ہے؟ ابھی پونا میں مولوی فضل الحق (شیرِ بنگال) سے غیر رسمی گفتگو ہو رہی تھی، انھوں نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا کہ "پاکستان کا نظریہ ناقابلِ عمل ہے ۔ یہ تو محض لیگ کا ایک اسٹنٹ (STUNT) ہے" —— مجھے ان کی اس بات پر بہت غصّہ آیا، میں نے ان سے کہا اگر آپ کو اس نظریہ سے اختلاف ہے یا اس کو ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں تو آپ میں

اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے تھی کہ قائدِ اعظم کے سامنے آپ کھل کر یہی بات کہہ دیتے، ان کے سامنے تائید اور دل میں بے یقینی ؟ اگر قائدِ اعظم کے دست و بازو ایسے ہی کمزور ہیں تو وہ اپنے مقصد میں کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں" ؟ اس کے بعد فرمانے لگے کہ "میں نے پھر نظریۂ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر ان سے تفصیلی گفتگو کی اور ان کو قائل کر دیا کہ یہ نظریہ ناقابلِ عمل ہرگز نہیں"۔

اِسی طرح مدراس کے تاریخی جلسہ میں خود زعمائے لیگ میں اس قدر داخلی انتشار تھا کہ "قراردادِ پاکستان" کا پاس ہونا بالکل غیر یقینی تھا، یہ بہادر یار جنگ مرحوم کی پرخلوص مساعی تھیں کہ وہ قرارداد اس جلسہ میں کامیاب ہو سکی، مرحوم نے یہ کیا کہ ایک ایک متذبذب یا مخالف تحریک زعیم لیگ سے نجی گفتگو کی اور بحث و تفہیم سے اس کو نہ صرف قائل کیا بلکہ تحریک کی صداقت کا یقین اس کے دل میں پیدا کیا اور خود راقم الحروف نے نواب صاحب کی زبانی سنا کہ جس صبح کو اجلاس مسلم لیگ میں یہ قرارداد پیش ہونے والی تھی، اس کی ساری رات نہ خود سوئے نہ ان مذبذبین کو سونے دیا، جب تک کہ ان کو تحریک سے متفق اور اس کا مؤید نہیں بنا لیا، پھر صبح جب اجلاس ہوا ہے تو قرارداد جس کا پاس ہونا بالکل غیر یقینی تھا، بلا اختلاف رائے پاس ہو گئی، پیر علی محمد راشدی جو ہمارے ملک کے سربرآوردہ اہلِ قلم، اہلِ سیاست اور لیگ کے قدیم کارکن رہے ہیں، انھوں نے "یوم بہادر جنگ" کے جلسوں میں بارہا نواب صاحب کے اس کارنامے کا ذکر علی الاعلان کیا ہے اور عینی شاہد کی حیثیت سے یہ شہادت دی ہے کہ اگر نواب صاحب نہ ہوتے تو مدراس کا یہ اجلاس قائدِ اعظم کی تمنا کو پورا نہ کر سکتا تھا۔

صوبۂ سرحد میں لیگ کی جانفروشانہ خدمت

مدراس سیشن کی طرح صوبۂ سرحد میں لیگ کی کامیابی بھی بہادر یار جنگ ہی کی سرفروشانہ خدمت کی رہینِ منت ہے، سرحد میں مسلم لیگ کا اثر بہت کم تھا، سردار اورنگ زیب خاں جو سرحد مسلم لیگ کے صدر تھے، محسوس کر رہے تھے کہ اگر ان کو بہادر یار جنگ کا عملی تعاون حاصل نہ ہوتا تو صوبہ سرحد کے انتخابات میں لیگ کا جیت جانا محال ہے، انھوں نے قائدِ ملت کو اصرار سے اس کی دعوت دی، ادھر یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ قائدِ اعظم پر جو قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ اس سے بچ نکلے تو عیادتی تار سردار اورنگ زیب نے بھی دیا، اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے لکھا کہ "میرے زخم تو اس وقت تک مندمل نہ ہوں گے جب تک سرحد میں مسلم لیگ کو فتح نہ ہوگی" اب سردار صاحب نے قائدِ ملت سے اور زیادہ شدید تقاضہ کیا، خطوط اور تاروں کی بھرمار کردی کہ جلد سرحد تشریف لائیں، مرحوم نے اس بارے میں جناح صاحب سے مشورہ کیا، جناح صاحب نے پہلے تو تائیدی جواب دیا مگر دوسرے خط کے ذریعے منع فرمادیا کہ کہیں اس کی وجہ سے نواب صاحب کے اور اعلیٰحضرت خسروِ دکن کے باہمی تعلقات خراب نہ ہوجائیں۔

ملاحظہ ہو مکاتیب بہادر یار جنگ (مکتوب ۴۴۸)

مگر خود نواب صاحب سے بھی رہا نہ گیا، اور جناح صاحب کو راضی کرکے اعلیٰحضرت کی ناراضی کا خیال کئے بغیر دورۂ سرحد پر روانہ ہوگئے۔

صوبۂ سرحد میں قائدِ ملت کی ہمراہی میں سردار اورنگ زیب خاں اور قاضی محمد عیسیٰ صدر مسلم لیگ بلوچستان نے دورہ شروع کیا، ——— سرحد میں فقیر ایپی کی ہولناک سرگرمیاں پوری دہشت انگیزی سے جاری تھیں، سرحد

کی سڑکوں پر سفر کرنا موت کی راہ پر چلنے کے مترادف تھا، ایسی پرخطر حالت میں تین عظیم لیگی موٹر پر چلے جارہے تھے، قاضی عیسیٰ موٹر چلارہے تھے، کوئی دشمن لیگ گولی چلاتا تو اس کا پہلا نشانہ قاضی عیسیٰ بنتے، شیر دل بہادر یار جنگ نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر کے قاضی عیسیٰ کے ہاتھ سے اسٹیرنگ لینے کی کوشش کی قاضی صاحب قائدِ ملّت کی زندگی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز اور گرانقدر سمجھتے تھے، اِس لئے وہ اسٹیرنگ چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے، اور قائدِ ملّت کا کہنا تھا کہ قاضی صاحب کی جان زیادہ قابلِ قدر ہے، غرض باہمی ایثار کی اس کشمکش میں قائدِ ملّت غالب آگئے اور اب موٹر اللہ کے ایک بہادر سپاہی کے ہاتھ میں تھی، اور فراٹے بھرتی ہوتی چلی جارہی تھی کہ ایک شخص نے موٹر روکنے کا اشارہ کیا، موٹر رُکی، وہ قریب آیا اور اس نے پُوچھا "آپ میں بہادر یار جنگ کون ہے"؟ قائدِ ملت نے اپنے سینہ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "میں" —— اُس نے تنہائی میں چل کر بات کرنے کی خواہش کی اور بتایا کہ فقیر ایپی کا پیام سنانا ہے، ساتھیوں نے بہادر یار جنگ کو منع کیا کہ ہرگز اس شخص کی بات نہ مانیں، مگر بہادر یار جنگ بے خطر اس شخص کے ساتھ چلے، اس شخص نے علٰحدگی میں بڑے ادب و اکرام سے عرض کیا:۔

"فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہمیں آپ کی یہاں تشریف آوری کی اطلاع تھی، اس لئے آپ کے سفر کے انتظامات کردیے گئے ہیں، آپ جہاں جہاں سفر کرنا چاہیں ہمیں اطلاع دے دیجئے تاکہ حفاظتی انتظامات کر دیے جائیں"۔

یہ تھی کرامت قائدِ ملّت کی، بقولِ جلیل ؎

جو میں چلوں تو سایہ بھی میرا نہ ساتھ دے ۔۔۔ جو تم چلو، زمین چلے آسمان چلے

اب کیا تھا، آگ گلزار ہو چکی تھی، قائدِ ملت کی زبان نے اہلِ سرحد کے دِلوں کو مسخر کر لیا اور ان پر مسلم لیگ کا نقش بٹھا دیا، اور ایسا بٹھایا کہ جب انتخابات ہوئے تو اسی سرحد میں جہاں لیگ کا نام لینا جرم تھا، لیگ ہی لیگ کی کامیابی رہی۔

لیگ کی تعمیر و استحکام میں اہم کردار

پیر علی محمد راشدی، قدیم لیگی زعیم جن کو بہادر یار جنگ کی رفاقت کا موقعہ خوب ملا ہے وہ اپنے ایک طویل مضمون "بہادر یار جنگ علیہ الرحمۃ والغفران" میں نواب صاحب کی لیگی خدمات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"ابھی عرض کر چکا ہوں کہ مسلم عوام کو تین پارٹیوں کی طرف سے دعوتِ شمولیت مل رہی تھی (سرکاری پارٹی، کانگریس اور لیگ) اور وہ سوچ رہے تھے کہ کس طرف جائیں، یہی موقعہ تھا جب ایک سپاہی سرزمینِ صادق سے روانہ ہوا، غالباً یہ تہیّہ کئے ہوئے کہ وہ اپنے ایک ہی عمل سے نہ فقط تاریخ کے سارے نئے پرانے قرضے ادا کر دے گا بلکہ مستقبل کی تاریخ کو بھی ہمیشہ کے لئے اپنا مقروض بنا لے گا —— یہ شخص بمبئی پہنچا، قائدِ اعظم سے سیاسی بیعت کی، ان کے عَلَم کے نیچے کھڑے ہو کر ملّتِ اسلامیہ کے اس بلالِ ثانی نے مسلم عوام کو صدا دی "مسلم ہو تو مسلم لیگ میں آؤ"۔ اب یہ "مسلم ہو تو...." کی شرط بڑی اہم چیز تھی، یہی رُوح تھی اس تحریک کی جو شروع ہو رہی تھی، یہی ابتدائی نکتہ تھا بننے والی تاریخ کا، یہی نچوڑ تھا

اس جذبہ کا جو ہماری ساری ظاہری بے سروسامانیوں اور بے حالتوں کے باوجود ہم کو آگے لے جانے والا تھا، یہی خشتِ اوّلین تھی، اس بنیاد کی جس پر بعد میں پاکستان کی عمارت کھنچنے والی تھی، ——— اس راستہ پر مسلم عوام کو لے چلنے والے تو یقیناً قائدِ اعظم تھے مگر جب مسلمانوں کا قافلہ اُس راستہ پر چل رہا تھا تو کسی مسافر نے مشعلِ راہ ضرور بہادر یار جنگ کے ہاتھ میں دیکھی تھی، ——— یہ وہی تھے جو راستے کے زیر و بم پر روشنی ڈالتے چل رہے تھے، یہ وہی تھے جو راستہ کے ہر موڑ کی حقیقت اور اہمیت سمجھاتے جاتے تھے، یہ وہی تھے جو تھکے ماندے اور متذبذب مسافروں کو اطمینان دلاتے چلے جاتے تھے ——— جب کبھی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کانگریسی (خواہ بعض لیگی) مولوی صاحبان کی یورش ہوئی یا انگریزی خواں طبقہ کی طرف سے "نئے وقت کی نئی ضروریات" کے بہانہ اعتراضات ہوئے، تو اکثر بہادر یار جنگ بلائے جاتے تھے، اور ان کی تصریحات سُن کر لوگوں کی آنکھیں کھُل جاتی تھیں، ان کے دلوں سے وسوسے اور شبہات ختم ہو جاتے تھے اور نئی ہمت کے ساتھ وہ اس قافلہ میں شامل ہو کر آگے چل پڑتے تھے، ——— ایک حقیقت بڑے سے بڑے ان مسیلمۂ کذاب سے بھی غالباً چھپائے نہیں چھُپے گی کہ مسلم لیگ تحریک کے دوران مرحوم نے بہ یک وقت بلالؓ اور غزالیؒ کے فرائض سرانجام دیئے اور وہ قطعاً

فیصلہ کن ثابت ہوئے ——۔
ممکن ہے بعض ناواقف یا فرومایہ لوگ یہ کہہ دیں کہ بہادر یار جنگ محض اچھے مقرر تھے اور بس —— مگر یہ کب ہوا، کہ محض تقاریر یا خطابت سے قوموں کی قسمتیں بدلیں ؟ ——
بہادر یار جنگ مرحوم کی عظمت کا حقیقی سرچشمہ ان کی زبان نہیں، بلکہ ان کا دلِ درد آشنا تھا ——۔
کئی اور صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک ہونے کے سوا بہادر یار جنگ مرحوم اپنے وقت کے بہت بڑے مدبّر اور ڈپلومیٹ بھی تھے۔ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۴ء تک لیگ کی سیاست میں کئی بار بحرانی حالات پیدا ہوئے، اور تقریباً ہر موقع پر بہادر یار جنگ مرحوم کی معاملہ فہمی، ان کا سیاسی تدبّر، ان کا تحمل اور بردباری قوم کے کام آئے، کبھی ظاہر اور کبھی پسِ پردہ ——
یہ موقع نہیں کہ ان کے سارے واقعات کی تفصیل دی جائے، میں صرف اشارۃً اسی دور کے بعض ایسے معاملات اور واقعات کا حوالہ دے رہا ہوں جن کے سلسلہ میں خاکسار نے بہادر یار جنگ مرحوم کو بڑی مستعدی سے بڑا ہی اہم پارٹ ادا کرتے ہوئے دیکھا مثلاً :۔

۱۔ پنجاب کی حکمران یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے معاملات،
۲۔ جناح سکندر پیکٹ،
۳۔ قراردادِ پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت والے صوبوں کے برسرِ اقتدار پارٹیوں کی رائے ہموار کرنا۔

۴۔ مسلم اقلیت والے صوبوں کے دو چار مسلم لیگی حضرات نے پسِ پردہ یہ بات چلا رکھی تھی کہ ہندوؤں کو پاکستان کے نام سے ڈرا دھمکا کر اُن سے اِس بات پر سمجھوتہ کر لیا جائے کہ بھارت کے ہر صوبہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی ہو، یعنی مسلم اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں کو ۵۰ فی صدی نمائندگی دی جائے اور جب یہ اصول قبول ہو جائے تو پاکستان کا مطالبہ چھوڑ دیا جائے، بہادر یار جنگ نے اس پسِ پردہ تحریک کو ختم کر دیا

۵۔ خاکسار اور مسلم لیگ کا تنازعہ، اور خاکسار فتنہ کا خاتمہ)

۶۔ برطانیہ کی قائم کردہ قومی دفاعی کونسل کے سلسلہ میں بحران اور مسلم وزرائے اعلیٰ کے مسلم لیگی ارکان کی سرکشی کا امکان،

۷۔ مدراس مسلم لیگ اجلاس کے موقع پر قراردادِ پاکستان کو لیگ کے اغراض و مقاصد میں داخل کرتے وقت جو اندرونی اختلافات پیدا ہو رہے تھے، ان کو روکنے کا بندوبست۔

۸۔ ریاستوں میں بسنے والے مسلمانوں کو اسٹیٹس کانگریس کے اثر سے نکال کر مسلم لیگ کے قریب لے آنا کہ والیانِ ریاست بھی حد سے زیادہ برہم ہو کر مسلم لیگ کے خلاف ہندوؤں کا ساتھ نہ دیں۔

۹۔ جمعیتہ العلماء (ہند) کے پیدا کردہ مسائل۔

۱۰ - بعض مسلم لیگی علماء کے اعتراضات۔

۱۱ - حیدر آباد کا مسئلہ۔

۱۲ - صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی تنظیم۔

۱۳ - ہندوستان بھر میں انتخابات۔

یہ اور اس قسم کے کچھ اور معاملات تھے، جن کے سلسلے میں محض تقریروں اور حسنِ خطابت سے کام نہیں چل سکتا تھا، معاملہ فہمی، تدبیر، تحمل، سنجیدگی اور اعلیٰ قسم کی ڈپلومیسی کی ضرورت تھی، بہادر یار جنگ مرحوم نے حضرت قائدِ اعظم کی قیادت و رہنمائی میں ان مسائل کے بارے میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہوئے ان ساری خوبیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ مظاہرے کئے ——"

(روزنامہ جنگ کراچی ۲۷ جون ۱۹۶۴ء)

مذکورۂ صدر نکات میں سے بعض کی تفصیلات پیر علی محمد راشدی صاحب نے اپنے ایک اور مضمون میں دی ہیں جو "اب انھیں ڈھونڈ چراغ رُخِ زیبا لے کر" کے زیرِ عنوان روزنامہ "جنگ" کراچی بابت ۲۶ جون ۱۹۶۵ء میں چھپا ہے۔

اتحاد المسلمین کو ایک کھٹک

باہر والوں کو مرحوم کی یہ ترقی اور ان کا یہ اثر کھٹک رہا ہوگا تو کون سے شبہ کی بات ہے، خود حیدر آباد میں جہاں رُوحِ حیات اُن ہی نے پھونکی تھی، اور جن کی وجہ سے "بیڑوں" نے بھی "شاہ بازی" کی "رسم وراہ" سیکھنی شروع کی تھی، اُن پر حسد کرنے لگے، صاف کہنے کی جرأت کہاں سے لاتے، البتہ جب زبان بندی کی مدت ختم ہوئی تو ایک جلسہ کیا گیا، مرحوم کی خدمات پر آفریں کہی گئی اور ساتھ ہی حسد کی چنگاری کو ہمدردی کی راکھ میں لپیٹ کر اِس طرح پیش کیا گیا، کہ

"آپ حیدر آباد ہی کے ہو جائیں، حیدر آباد ہی آپ کی تمام تر توجہ کا محتاج ہے، بیرونی مصروفیات سے حیدر آباد کے امور کی بجاآوری پورے طور پر نہ ہو سکے گی وغیرہ۔"

حالانکہ یہاں کا سب سے زیادہ بار مرحوم ہی کے دوش پر تھا اور سب سے زیادہ کام (باوجود اور مصروفیات کے) مرحوم ہی کیا کرتے تھے، مرحوم نے سپاسنامے کا جواب ان الفاظ میں دیا، جو ان کی بصیرت کا بہترین نمونہ ہے:-

"میرا مقصدِ حیات ایک اور متعین ہے، اور وہ ملّتِ اسلامیہ کی خدمت ہے، آپ عام طور پر تمنّا کر سکتے ہیں کہ میں ملّتِ اسلامیہ کے ساتھ "دکن" کا لفظ بڑھا دوں اور مجھے اس میں بھی عذر نہیں ہے، کیونکہ میں خود دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں عالمِ ارضی پر بسنے والی ساری ملّتِ اسلامیہ کی خدمت کر سکتا ہوں، مجھے اپنی محدود طاقت اور صلاحیت کا اندازہ ہے، خود انبیاء علیہم السّلام کے حدودِ عمل، جن کے ساتھ وحی و الہام کی طاقتیں ہوا کرتی تھیں، ہمیشہ محدود رہے، اور ساری صفِ انبیاء میں صرف ایک قدسی مرتبت ذات ہم کو ایسی ملتی ہے جس کے حدودِ عمل کافۃ الناس کے لئے بسیط ہیں، انؐ کے غلاموں کی خاکِ پا کو اپنے لئے سرمۂ چشم بصیرت سمجھتا ہوں، غیر محدود خدمت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، بے شک میرا مخدوم ملّتِ اسلامیہ "دکن" ہے،

لیکن! آپ کو جاننا چاہیئے حیدر آباد، ہندوستان کے

سمندر میں ایک جزیرہ ہے، اس سمندر سے جتنی سیاسی لہریں اٹھتی ہیں وہ لازماً اس جزیرہ سے ٹکراتی ہیں، اور کوئی شخص ملّتِ اسلامیہ دکن کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا جب تک وہ ہندوستانی سمندر سے اٹھنے والی سیاسی لہروں پر قابو نہ رکھتا ہو یا کم از کم ان سے قریب ترین یا راست واقفیت نہ رکھتا ہو میری تمام بیرونِ حیدرآباد مساعی کی علّتِ غائی انھیں لہروں سے قریب تر رہنے کی تمنّا ہے —— کوئی شک نہیں کہ حیدرآباد سے باہر قدم رکھنے کے بعد میری روشنیٔ طبع، میرے لئے بلا ہوگئی اور میرے نغموں نے ہر چمن میں میرے لئے ایک دام بچھا دیا اور ہر صوبہ ہند نے چاہا کہ میں اس کے قفس کا اسیر ہو جاؤں لیکن آپ اطمینان رکھیں، دام چاہے کتنے ہی ہم رنگ زمین ہوں، اُن کو پہچانتا ہوں اور اگر کبھی ان میں پھنسا بھی ہوں تو عمداً اور اپنے پروں کی طاقت کا اندازہ کر کے اس یقین کے ساتھ پھنسا ہوں کہ دام کو لیکر اڑوں گا اور صیاد سمیت حیدرآباد سے قریب تر کر دوں گا۔"

(مارچ ۱۹۴۴ء دارالسلام)

اتنے صاف صاف اور سچے سچے خیالات کو پیش کرنے کے باوجود بعض نادان دوستوں کو اب بھی یہی خیال دامنگیر رہا کہ قائدِ ملّت ہمارے ہی لئے مخصوص ہو جائیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں ضلع ورنگل کے مسلمانوں نے ایک سپاس نامہ پیش کیا جس میں وہی سوال اٹھایا گیا۔ اب کی دفعہ مرحوم نے پھر جتایا:۔

"لب کشائی پر مبارک باد دینے کی بجائے زبان بندی پر دی

جانی چاہیئے تھی، اللہ کا فضل ہے کہ اس نے زاغ وزغن میں سے نہیں بنایا، بلکہ ؎

شہپر زاغ وزغن دربند قید وصید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز وشاہین کردہ اند

"میرا دل دکھتا ہے جب دیکھتا ہوں کہ وہ تعلق خاطر جو اپنی تنظیم اور اپنے مرکز سے ہونا چاہیئے، صدر جماعت اور قائد سے ہوتا جارہا ہے، ملّتِ اسلامیہ کے تعلق کو اشخاص سے دیکھ کر مجھے ڈر ہوتا ہے کہ اس کا تعلّق خدا سے کم نہ ہو جائے، ایسی حالت میں اگر میں صرف باہر کا ہو جاؤں تو تعجّب نہ ہونا چاہیئے، اس لئے کہ اشخاص سے آپ کا تعلّق ٹوٹے اور اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے لگیں۔"

(رہبرِ دکن ۱۷ اپریل ۱۹۴۴ء)

آزمائشیں اور ایثار

مقروضیت اور پھر مالی فراخی کی ابتلاؤں میں بہادر یار جنگ مرحوم جس پامردی اور خدا ترسی کا کردار ادا کر گئے اس کی تفصیل گذر چکی، مگر آزمائشیں اسی پر ختم ہو نہیں گئیں بلکہ ان کا ایک سلسلہ آخر حیات تک قائم رہا۔

بے اولادی

مرحوم کے صرف ایک لڑکی تھی، ماں باپ کی ساری آرزؤں کا مرکز و محور، مگر آٹھ برس کی ہونے نہ پائی تھی کہ رحلت کر گئی، بڑے صبر کا مقام تھا اور بہادر یار جنگ یہاں بھی ایک نمونہ بن کر ملت کے سامنے پیش ہوئے، مسلمانوں کی ایک رفاہی کمیٹی کا اس روز اجلاس تھا، مرحوم اپنی چہیتی بیٹی کو سپرد خاک کر کے سیدھے اس کمیٹی کے اجلاس میں پہنچ گئے اور اپنے قیمتی مشوروں سے اس کی رہبری فرماتے رہے۔

صدر المہامی کا لالچ

مجلس اتحاد المسلمین جب ایک طاقتور تنظیم بن گئی تو حکومت نے اس کے قائد کو (صدر المہامی (وزارت) کے جلیل القدر عہدہ کی پیش کش کی، مگر یہ ایسی ہی بات تھی جیسے کسی عنقائے بلند پرواز کو طلائی پنجرہ دکھا کر مائل کرنے کی کوشش کی جائے قائد ملت کا اس پیش کش پر ردعمل ظاہر ہے کہ ایک حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

مشترکہ قیادت کی پیشکش

ریاست کا کانگریسی طبقہ قائد ملت کی مستحکم قیادت سے کچھ کم پریشان نہ تھا. اُس نے اس قوت کو توڑنے کے لئے بار بار ہندو مسلمان کی مشترک قیادت کا عطیہ پیش کیا، مگر اقبال کی زبان میں مرحوم کا جواب یہی رہا.

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

قتل کی دھمکی

جب تحریص کا ہر وار ناکام رہا تو حکومت کی جانب سے بھی اور کانگریسیوں کی طرف سے بھی قتل کی دھمکیاں دی گئیں، اس کے منصوبے بھی تیار کئے گئے مگر مرحوم نے اس کی کوئی پَروانہ کی، البتہ چوکس ضرور رہتے تھے. ایک واقعہ جس کو چُھپا دیا گیا تھا یہ پیش آیا کہ ایک ہندو شولا پور سے نواب صاحب کے قتل کا منصوبہ باندھ کر حیدرآباد آیا، ڈیوڑھی پر پہنچکر نواب صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری سے ملنے کی اجازت مانگی اور مقصد صرف نواب صاحب کی شخصیت سے شرف نیاز حاصل کرنے کا شوق ظاہر کیا، نواب صاحب اُس شخص کی شولا پور سے نقل و حرکت اور عزم مسموم سے باخبر تھے اور گویا منتظر ہی بیٹھے تھے، شاہ عالم خاں مرحوم جو نواب صاحب کے نجی امور کے کرتا دھرتا تھے، ان کو اور اپنے پرائیوٹ سکریٹری کو نواب صاحب نے دوسرے کمرے میں چلے جانے کی ہدایت کی اور اس ہندو کو بلا کر اپنے سامنے بٹھا لیا. اس شخص نے تمہیدی گفتگو شروع کی کہ مجھے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا وغیرہ وغیرہ. نواب صاحب نے فرمایا "راجہ یہ سب باتیں چھوڑیئے، کچھ کام کی بات کیجئے، آپ کا پستول تو نکالئے" اور یہ کہتے ہوئے نواب صاحب نے اپنا پستول

سنبھالا، اس ہندو کے کپکپی چھوٹی اور بدحواس ہوگیا تو نواب صاحب مرحوم نے شاہ عالم خاں صاحب کو جو یہ منظر دیکھ رہے تھے آواز دی اور اس شخص سے ڈانٹ کر فرمایا کہ "یہ کمینوں کے کام ہوتے ہیں، یہاں سے نکل جاؤ" چنانچہ وہ پستول چھوڑ لڑکھڑاتا ہوا چلا گیا۔

شخصی اتہام

حکومت و اغیار کی طرف سے جو باتیں پیش آتی رہیں وہ الگ ہیں ان کے علاوہ خود اپنوں نے مجلسی مسلمانوں کے ایک محدود گروہ نے بھی کبھی بددیانتی کا الزام لگایا۔ کبھی غرور و تکبر سے متہم کیا، سیاست ناشناسی کی پھبتی ایسے لوگوں نے کسی، جن کو کسی درجہ سیاست کا شعور خود قائد ملت کے طفیل میسر آیا تھا، ظاہر ہے کہ ایثار، قربانی اور بے لوث خدمات کا یہ صلہ ہمت شکن نہ سہی پست ہمت ضرور کر دیتا ہے مگر یہ بہادر یار جنگ کی للہیت تھی کہ وہ مخلوق کی طعنہ زنی سے بے پروا، اپنے کام میں پوری قوت سے بڑھتے ہی گئے۔

ع خلقے پس دیوانہ و دیوانہ بکارے

ریاست بدر کرنیکی دھمکی اور تقریر پر پابندی

اس کا تذکرہ تفصیل سے پچھلے باب میں گذر چکا۔

جاگیر کی واپسی

اب مرحلہ جاگیر کا بھی آگیا۔ ایک فرمان شاہی نکلا کہ "منصب دار اور جاگیر دار ملازم سرکار متصور ہوگا" اور ملازم سرکار پر پہلے ہی سے سیاسی مشاغل کی پابندی عائد تھی، جب یہ فرمان بہادر یار جنگ کے سامنے آیا ان کے لئے دو میں سے ایک چیز کا انتخاب ضروری ہوگیا۔ جاگیرداریت کو بحال رکھ کر قومی

قیادت سے ہاتھ اٹھالیں یا قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے کر جاگیر کو حوالۂ سرکار کر دیں۔ مرحوم نے دوسرا پہلو اختیار فرمایا اور ہزارہا ہزار مسلمانوں کے مجمع میں شیر دل قائد نے برق پاش آواز میں اعلان فرمایا۔

"میں یقین رکھتا ہوں کہ یہ امتحان وفا کا وقت ہے۔ مجھ سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خود غرض، تن آسان، بندۂ زر اور نمک حرام نہ ہوگا اگر میں اس زمانہ میں محض اپنی جاگیر اور اعزاز کے خیال سے مالک اور ملت و ملک کی خدمت گزاری سے روگردانی کروں۔ یہ تو بہت مبارک ہوا کہ اب دیوانہ کوئے محبت جیب و دامن کی فکر سے بھی آزاد ہو رہا ہے۔"

چنانچہ جاگیر واپس کر کے زیادہ مطمئن، بے فکر اور اپنے مشن میں زیادہ سرگرم ہو گئے اور حیدرآباد سے باہر کل ہند سرگرمیاں اب زیادہ آزادی سے جاری رہیں، تقریر بندی کا امتناع اب خود بخود ختم ہو چکا تھا پھر بھی ایک وفادار حیدرآبادی کی حیثیت سے نواب صاحب نے دہلی میں تقریر کرنے سے قبل حکومت حیدرآباد سے اپنی آزادئ تقریر کی صراحت مانگی۔ جوابی تار حکومت کی جانب سے یہ ملا۔

"Since you have renounced all honours on your own accord now you have become a free man to do as you Like.

"چونکہ آپ نے اپنے تمام اعزازات از خود واپس فرمائے ہیں اس لئے اب آپ ایک آزاد انسان بن کر جو چاہیں کریں۔"

یہ جون ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے، ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۱، ۴۷۹ بنام قائد اعظم

مورخہ ۳۰ رجون ۱۹۴۳ء مشمولہ مکاتیب بہادر یار جنگ

اعزازات کی واپسی پر زور حکومت نے ایک سال تک قائد ملت کی وسیع تر جدوجہد کو دیکھتے ہوئے مناسب یہی سمجھا کہ جاگیر و خطاب ان کو واپس کر کے انھیں کسی قدر مقید رکھا جائے، چنانچہ محولہ بالا مکتوب (بنام، قائد اعظم) کا ابتدائی فقرہ ملاحظہ ہو:۔

"قائد اعظم!

آپ کا خط مورخہ ۲۰ رجون پہنچا، میں خود آپ کو یہاں کے حالات سے اطلاع دینے والا تھا، میری دہلی سے واپسی کے بعد حکومت اور اعلحضرت اس امر پر غور کرتے رہے کہ میری تقریروں پر جو پابندی عائد کی گئی تھی، اس کو برخاست کر کے میرے جاگیرات اور اعزازات مجھے واپس کر دیئے جائیں۔ اب بھی یہ خبر گرم ہے کہ یکم رجب کو اپنی سالگرہ کی تقریب میں ایسا کیا جائے گا۔ میں نے چونکہ ان امور سے اب کوئی دلچسپی نہیں رکھی ہے اس لئے تفصیلات معلوم نہ کر سکا۔"

قائد ملت تو ان امور سے بے پروا رہے مگر حکومت نے بار بار جاگیر و خطاب کی قبولیت پر اصرار شروع کیا حتیٰ کہ مجلس اتحاد المسلمین کے عہدہ داروں نے بھی اس کی تائید کی مگر قائد ملت نے مرتے دم تک پھر ان حکومتی اعزازات کو اپنے دامن اخلاص و ایثار کا داغ دھبہ ہی سمجھا اور پاک دامن ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔

○

سانحۂ وفات

آخری زمانہ

وہ بجلی جو آسمان ہند کے گوشہ گوشہ میں کوندتی رہی اور جس کا منشار ہی ہر باطل عمارت پر کڑک کر گرنا اور جلا کر راکھ کر دینا تھا۔ اب عدم کے پردہ میں ہمیشہ کے لئے چھپ جانے کو ہے، وہ چراغ جس سے سیاست کی مجلسیں نورانی اور مذہب کی محفلیں درخشاں ہوتی رہیں، اب بجھا چاہتا ہے۔

کوئی دَم کا مہماں ہوں اے اہل محفل
چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

اب ایسا بہادر مسلمان، ہمدرد قائد، بے غرض خادم قوم اور سچا عاشق رسولؐ ہمیشہ کے لئے چھن جائے گا۔ مسلمانانِ ہند تم اب نکتہ چینیوں اور بدخواہیوں میں رہو یا اس کی تعریف میں زبانیں خشک کر لو لیکن وہ تو سب کچھ کر کے اب بارگاہ رب العزت میں نتیجہ کا منتظر ہے۔

محمدؐ بہادر خاں کی ہر آنے والی گھڑی گزشتہ ساعت سے شاندار اور باجمال رہی عمر کے آخری لمحہ تک ان کا ستارۂ اوج برابر چڑھتا ہی رہا مذہب آمیز سیاست مرحوم کا خاص وصف تھا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا تھا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، دکن کے لوگ تو اس حیثیت سے خوش قسمت رہے کہ انھیں پہلے ہی سے حقیقی سیاست کا درس ملا تھا لیکن لاہور کے سالانہ جلسہ (لیگ) کی تقریر نے سارے ہندوستانی مسلمانوں کی

آنکھیں کھول دیں نری سیاست کے راگ آلاپنے والوں کے گلے بیٹھ گئے اور کراچی کے اجلاس والی تقریر نے تو مسئلہ بالکل ہی صاف کر دیا، ہر پڑھے لکھے اور حامیٔ لیگ پر سیاست کا راز کھل گیا۔ نفس کے بندے اور خدمت خلق کا نعرہ لگا کر حکومت میں مقام حاصل کرنے والے پریشان ہو گئے اور حقیقت پسند افراد سنبھل کر اصلاح کی فکر میں لگ گئے۔

مرحوم کے آخری تین چار برس بڑی مصروفیت کے رہے، مجلس اتحاد المسلمین کے مسائل، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کی الجھنیں پھر خود مسلم لیگ کے غیر معمولی فکری اور عملی مشاغل نے پوری نیند تک حرام کر دی تھی، رمضان شریف کے مہینوں تک میں آرام نصیب نہ ہوتا تھا، مطالعہ کا شغف ایسا کہ ان تمام بکھیڑوں کے باوجود روزانہ علوم مذہبی اور معلومات حاضرہ کے ذخیرہ میں اضافہ کئے بغیر چین نہ آتا تھا، اس مسلسل جسمانی مشقتوں، دماغی کاوشوں اور قلبی اثرات نے مرحوم کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا، بال پکنے لگے، بغیر عینک کے پڑھنا مشکل ہو گیا، نزلہ اور گلے کے مرض نے مستقل صورت اختیار کر لی حتیٰ کہ سردیوں میں صبح دس بجے تک بلند آواز سے بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ غدود نکال دیئے جائیں تو تکلیف رفع ہو جائے گی، مگر چونکہ اس سے آواز پر برا اثر پڑتا تھا مرحوم نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "آواز میرا ایک بڑا حربہ ہے اور اس سے مسلمانوں کی کافی خدمت ہوتی ہے اس لئے اس کو خراب کرنا گوارا نہیں" ـــــــ نسلی پٹھان تھے قوی ہیکل جسم رکھتے تھے اسی مناسبت سے خوراک بھی کافی تھی لیکن جب سے ان بیماریوں نے آ گھیرا تو ناشتہ صرف دو ایک سیب، اور رات کی غذا صرف دودھ یا ایسی ہی کسی ہلکی چیز تک محدود ہو گئی تھی البتہ دوپہر میں پیٹ بھر کھا لیتے

تھے لیکن اس کے باوجود جسم بالکل صحت مند اور قویٰ بہت اچھے تھے۔

آخری یوم حیات کی تقریر

مرحوم اپنی زیست کی آخری سانس تک ملّت کی خدمت میں منہمک رہے

۲۵ جون ۱۹۴۴ء اتوار کے روز دِن کے ساڑھے گیارہ بجے آخری تقریر فرمائی، جو سلاست اور حقیقت کی بناء پر اس قابل ہے کہ یہاں درج کی جائے۔ مرحوم نے ایک مدرسہ عربیہ نسواں کا معائنہ فرمایا۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں سے صرف ونحو کے بعض سوالات پوچھے، کچھ ترجمہ کروایا اس کے بعد اپنے خاص طرز میں گفت گو شروع فرمائی:-

"میں تمہاری تعلیم سے بجد خوش ہوا، اب کچھ نصیحت کی باتیں سُن لو، علم کو خدا نے بہت فضیلت دی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔ علم ادم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملائکۃ فقال انبونی باسماء ھولاء ان کنتم صادقین۔" اسی طرح حدیث نبویؐ میں مروی ہے "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ[1]" شاید تم کو معلوم ہوگا کہ علم کی دو قسمیں ہیں ایک علم ابدان اور دوسرا علم دین، علم دین کو دیگر علوم پر فضیلت حاصل ہے یہ تمہارے سوچنے اور عمل کے طریقوں کو دُرست بناتا ہے، خدا کا خوف اور سچّی محبت سکھاتا ہے، اور روحانی ترقی میں مدد دیتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کا سیکھنا شروع میں کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوگا لیکن کچھ دشوار نہیں، اُمید ہے کہ تم ہمت سے کام

---

[1] طلب علم ہر مسلم مرد و زن پر فرض ہے۔ (ترجمہ)

لیں گی، کیا وجہ ہے کہ سات سمندر پار والوں کی زبان سیکھتی ہیں اور تم کو آ جاتی ہے اور عربی زبان جو تمہارے قرآن کی زبان ہے مشکل معلوم ہوتی ہے۔ کوشش کرنے سے کیا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اب تم خود دیکھتی ہو، مسز صوفی جو حیدرآباد کی لائق ترین خواتین میں سے ہیں، ان کو عربی، فارسی، اُردو، انگریزی سب زبانیں آتی ہیں۔

عزیز بیٹیو! مجھے تم سے جو تمنا ہے وہ یہ ہے کہ تم ماں باپ کی اچھی بیٹی بنو، بھائیوں کی اچھی بہن بنو، بچوں کی اچھی ماں بنو، تمہاری گودوں میں قابل قدر قوم پل کر بڑی ہو، یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تم پوری طرح اپنے کو اس لائق نہ بناؤ۔

وہ عورت کیا جس کو گھر سے باہر رہنے میں، جلسوں اور کلبوں میں مزہ آئے، ایسی تعلیم سے بہتر ہے وہ تعلیم جو تم کو یہاں دی جا رہی ہے، مجھے تمہاری ترقی دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی، اُمید ہے کہ تم خوب پڑھو گی اور جو پڑھو گی، لکھو گی اور یاد رکھو گی اس پر عمل بھی کرو گی۔ وہ علم کیا جس پر عمل نہ کیا جائے، یاد رکھو میں تمہیں امام شافعیؒ کا ایک مقولہ سناتا ہوں تم اسے ہمیشہ کے لئے یاد رکھنا۔ ع

"شکوت الی وکیع سوء حفظی ؛ فاوصانی الی ترک المعاصی"

فان العلم نورٌ من الٰہٖ ؛ ونور اللہ لایعطیٰ لعاصیؔ"

ؔ میں نے وکیع (امام شافعی کے اُستاد) سے اپنے سوءِ حافظہ کی شکایت کی تو انھوں نے فرمایا تم گناہوں کو ترک کردو کیونکہ علم" انوار الٰہی میں سے ہے اور اللہ کا نور کسی گناہ گار کو عطا نہیں کیا جاتا۔" (ترجمہ)

خدا کرے تم اچھی بیٹی، اچھی بہن، اور اچھی بیوی بنو، پھر تم ہر قسم معاصی کو ترک کر دو گی —— بے جا مذاق معاصی میں داخل ہے، چغلی اور ایک دوسرے کی بُرائی کرنا معاصی ہیں. دوسرے کا قلم لے لینا، ماں باپ سے بدزبانی کرنا معاصی میں داخل ہے، خدا تو ماں باپ کے بارے میں فرماتا ہے کہ تم انھیں "اُف تک نہ کہو" اس لئے نافرمانبرداری بھی معصیت ہے، چھوٹوں پر شفقت سے پیش آؤ بڑوں کی اطاعت اور ادب کرو، جھوٹ اور غیبت سے بچو، سمجھ لو، ترک نماز گناہ ہے. ان سب پر عمل کرو ورنہ تمہاری تعلیم بیکار ہے اُمید کہ تم ان دو چار باتوں کو یاد رکھو گی اور عمل کر کے دوسروں کو عمل کی ترغیب دلاؤ گی۔"

قوم کے شفیق باپ کی اپنی بچیوں کے نام یہ آخری وصیت تھی —— کتنی اثر میں ڈوبی ہوئی اور پُر خلوص.

آخری محفل درس اقبال

اسی یکشنبہ کی شام کو "بیت الامت" (دولت کدہ بہادر یار جنگ مرحوم) میں درس اقبال کی محفل تھی، ہمیشہ کی طرح مرحو بھی شریک رہے — البتہ دو چار روز سے یہ مصرعہ ورد زبان تھا اور بار بار عجیب پُر اثر انداز میں پڑھتے جاتے تھے. ع

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

غرض زبان سے اور اپنے حال سے تشریح اقبال میں معاونت فرماتے رہے، اقبال کی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کی جلال آفریں نظم "حکمتِ کلیمی" کا یہ شعر آیا ہے ؎

"مردِ حق افسوں ایں دیرِ کہن
از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن"

شعر کی توضیح ہو چکی تو مرحوم نے فرمایا کہ یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں، آج یہیں ٹھیر جاتیں۔ درس ختم ہو گیا۔

شہادت گاہ کی طرف جلتے ہیں!

اسی رات مرحوم کو اپنے ایک قدیم دوست جسٹس ہاشم علی خاں کے ہاں دعوت تھی، کسے خبر تھی کہ یہ دراصل دعوت مرگ ثابت ہو گی، مغرب کی نماز پڑھ کر مرحوم اپنے دوست کے گھر "بنجارہ ہل" تشریف لے گئے۔ مرحوم کے ساتھ گوالیاری نووارد ایڈوکیٹ لیاقت اللہ قریشی تھے جو اسٹیٹس مسلم لیگ کے تعلق سے نواب صاحب سے قریب ہوئے اور بظاہر قریب تر ہونے کے لئے حیدرآباد ہی چلے آتے تھے کہ یہیں رہ پڑیں گے۔[1] مشہور عام روایت یہ ہے کہ انھوں نے دوران راہ موٹر پر ایک پان کا بیڑا نواب صاحب کو پیش کیا اور نواب صاحب نے کھا لیا۔ ہاشم علی خاں صاحب کے گھر پہنچے تو یہاں ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی اور دیگر احباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ نواب صاحب ڈاکٹر رضی الدین کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئے اور ابھی چونکہ درس اقبال کی محفل سے اٹھ کر آرہے تھے۔ اس لئے طبیعت پر وہی اثر تھا، اپنے پُرکشش انداز میں کلام اقبال کے محاسن بیان فرمانے لگے، کھانے میں ذرا دیر تھی، وہ پان جو موٹر پر کھلایا گیا تھا، اسمیں

---

[1] دیکھئے مکتوب (۲۱۸) مکاتیب بہادر یار جنگ، اس میں نواب صاحب قریشی صاحب کو لکھتے ہیں۔ "آپ نے اس مکتوب میں ہجرت کا عزم مصمم ظاہر فرمایا ہے اس لئے اب میں انصاری بننے کے لئے تیار ہوں، میرے گھر کے دروازے ہر وقت آپ کے لئے کھلے ہیں۔" یہ قریشی صاحب اس حادثہ کے بعد حیدرآباد سے غائب ہی ہو گئے ان کے اس فرار سے لوگوں کا گمان ہی رہا کہ وہ اسی کام کے لئے بھیجے ہوئے آئے تھے۔ واللہ اعلم

نہ جانے کیا بلا تھی کہ اس کے اثر سے نواب صاحب کے معدہ میں بھوک کی ناقابل ضبط کھر چن پیدا ہوئی اور بے چین ہو کر بالکل خلاف عادت انھوں نے ہاشم علی خاں صاحب سے کہا "بھئی آخر کھانا کب لگے گا، جلدی کرو" ــــــــ ہاشم علی خاں اہتمام میں لگ گئے، ادھر کسی نے ایک حقّہ نواب صاحب کے آگے لا رکھا، نواب صاحب ایک کش بھی پورا نہ لے سکے تھے کہ ایک زبردست جھٹکا لگا اور اس کے بعد معاً ایک تشنجی دورہ پڑا کہ وہ مُنھ کے بل گر پڑے اور ابھی لوگ سنبھالنے بھی نہ پاتے تھے کہ یہ "مردِ حق" دیر کہن کے "افسوں" کو توڑ کر ربی الاعلیٰ سے جا ملا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون بقول مولٰنا عبدالماجد دریابادی "جس سپاہی نے اپنے کو اللہ کے ڈسپلن (اطاعت) کا خوگر بنا لیا تھا. اس کی روح پکار ہونے پر معاً لبیک کیوں نہ کہتی؟ تاخیر اور تامل کی وجہ سے ایک منٹ کے لئے بھی آخر اُسے کیا ہو سکتی تھی؟"

بنجارہ ہل سے نعش "بیت الامت" لائی گئی، تکفین کے بعد لاکھوں کے غمگسار مجمع نے دارالسلام کے وسیع میدان میں نماز جنازہ پڑھی اور یہاں سے اپنے محبوب قائد کی نعش کندھوں پر اٹھاتے شہر سے چار میل دور مشیر آباد کے ایک گوشہ میں دفن کرنے لے آئے ؎

کِس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

"خوش نصیب قبر خوش ہو کہ تجھ میں آرام پانے کے لئے اللہ کے دین کا دلیر اور باہمّت سپاہی آرہا ہے، وہ غریبوں کا سہارا تھا بیکسوں کا والی تھا ملت کا پشت پناہ تھا" (صدق)

جس وقت جنازہ بیت الامت سے اٹھایا گیا ہے تو لوگوں نے دیکھا

اور انتہائی تعجب سے دیکھا کہ پچاسوں بیوائیں، سینکڑوں بے یار و مددگار روتے روتے نیم مردہ ہو چکے تھے اور ان کی سسکیوں کے ساتھ اگر کوئی آواز آتی تھی تو یہی کہ "اب ہم کس کے سہارے جئیں؟" لوگ سمجھتے تھے کہ بہادر یار جنگ کی داد و دہش مجلس اتحادالمسلمین یا لیگ کے فنڈ ہی تک محدود تھی، آج یہ بھید کھلا کہ خفیہ ہاتھ سینکڑوں کا سہارا بنا ہوا تھا۔ عجیب تر بات یہ ہے کہ چار میل کی طویل مسافت محمد بہادر خاںؒ کے جنازہ نے جن کندھوں پر طے کی وہ غریبوں ہی کے کندھے تھے، یہ غریب اس غریب نواز کی نعش سے کچھ اس طرح لپٹے رہے کہ دوسروں کو ہاتھ لگانے کا موقع ہی نہ دیا۔

موت یا شہادتِ حسنیٰ

غرض ۳ رجب ۱۳۶۶ھ م ۲۵ جون ۱۹۴۴ء شب دوشنبہ وہ مبارک ساعت تھی، محمد بہادر خاںؒ کے حق میں، جبکہ ان کی بے تاب روح ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو گئی لیکن آہ ثم آہ، کتنی الم انگیز اور روح فرسا تھی یہ رات مسلمانانِ ہند کے حق میں جبکہ ان سے اُن کا حقیقی میرِ کارواں چھن گیا، ان کی متاعِ عزیز لٹ گئی۔ ع

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

ہر طرف سے غُل اُٹھا، ایک شور بپا ہوا کہ یہ موت تھی یا شہادت؟ واقعی یکایک حرکت قلب رک گئی یا اس کے سامان فراہم کئے گئے؟ صاف اور بے غبار بات یہی ہے کہ یہ کام ایک منصوبہ کے تحت ہوا، پان میں یا حقہ میں سنکھیا دیا گیا۔ جس کے اثر سے مرحوم کے جسم پر بڑے بڑے سیاہ داغ پڑ گئے تھے، فوری طور پر ڈاکٹروں نے بھی زہر رسانی ہی کی تصدیق کی اور خود نظام دکن اعلیحضرت میر عثمان علی خاں مرحوم نے بھی (جو باضابطہ طب پڑھے ہوئے بھی تھے) نعش دیکھ کر بے ساختہ یہی ارشاد فرمایا،

"جس کسی نے کیا بہت بُرا کیا"

ایک مجمع نے شاہ دکن کے اس حسرت آمیز جملہ کو سُنا، البتہ یہ ضرور ہوا کہ جب عوام کی طرف سے تحقیق حقیقت کے آوازے اٹھنے لگے تو اتحاد المسلمین کے مخالف حکام ریاست نے بعض ڈاکٹروں کی تائید سے یہ اعلان شائع کیا کہ "حرکت قلب یکایک بند ہو جانے سے مرحوم کا انتقال ہو گیا ہے"

بہ ہر حال یہ تو واقعہ وصال ہوا، ویسے ہفتہ عشرہ ہی سے انداز بدل چکے تھے، گھر میں اور باہر جس سے بھی گفتگو فرماتے تو اسی انداز کی کہ "اب ہمارا کیا ہے"! لیکن کس کا واہمہ رہبری کر سکتا تھا کہ واقعی اب یہ ناسوت کی بندشوں سے آزاد ہونے والے ہیں۔ ٹاؤن ہال میں سالِ نو کا جشن نواب صاحب کے وصال سے چار پانچ روز قبل ہی تو ہوا تھا، ہمیشہ کی طرح بڑی حقائق پرور اور جلال آفریں تقریر کی اور آخر میں شاہ دکن کے لئے بڑے ہی پُر اثر لہجہ میں دُعا فرمائی اور ہزاروں کے مجمع میں یہ بھی فرما دیا کہ "میر عثمان علی خاں کے لئے یہ ہماری آخری دعا ہے" —— یہ سب کچھ ہوا لیکن کسی کو نہ گمان ہوا نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ان الفاظ میں لغوی حقیقت پنہاں تھی۔!!

حیاتِ نو کی بشارت

جس رات مرحوم نے وصال فرمایا، بہت سے صاحب دل اور نیک بزرگوں کو مختلف بشارتیں ہوئیں اور بعد میں بھی ہوتی رہیں۔ صرف ایک بشارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

امجد حیدر آبادی (مشہور صوفی منش رباعی گو شاعر) نے خواب میں دیکھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آپ کے دونوں جانب حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ تشریف

کھتے ہیں، ایسے میں ایک جنازہ پیش ہوا، صحابہ نے عرض کیا،

"حضورؐ یہ کس کا جنازہ ہے؟"

ارشادِ مبارک ہوا:

"یہ میرے حبیب محمدؐ بہادر خاں کا ہے۔"

اس کے بعد اور کچھ تعریف کے الفاظ نطقِ نبویؐ سے نکل رہے تھے کہ امجد صاحب کی آنکھ کھل گئی ـــــ اللہ اللہ کیا شرف ہے اور ابدی زندگی کی کیسی روشن صبح ہے! ـــــ

محمدؐ بہادر خاں کا عشقِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مچلنا، تڑپنا رائیگاں نہ گیا خوب ہی داد ملی اور یقین ہے کہ جو بھی یہ شیوہ اختیار کرے گا۔ اس کو ایسا ہی اجر ملے گا!

اعلحضرت کا اعتراف و تعزیت

حیدر آباد کے روزنامہ تنظیم نے بہادر یار جنگ کی وفات پر ایک "قائد ملت نمبر" نکالا تھا، اس میں خسرو دکن اعلحضرت میر عثمان علی خاں کا یہ اعتراف و اظہار چھپا تھا:

"یہ بڑا نازک زمانہ ہے اور یہ وقت اُن کی خدمات کا تھا، جو کام انھوں نے قوم و مذھب کے لئے انجام دیئے وہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے، اِنسان کی قدر مرنے کے بعد ہوتی ہے، ان کا بدل نہیں مل سکتا۔ سینکڑوں برس صبح و شام کی گردشوں کے بعد دنیا ایسا آدمی پیدا کرتی ہے جو اپنی صفات اور خدمات کی وجہ سے قوم میں ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔"

اس کے ساتھ ملک الشعراءؔ[1] کا یہ فارسی قطعہ بھی چھپا تھا جس میں انھوں نے بہادر یار جنگ کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

گرفتہ بخششے از دست قادر
برائے حفظِ حقِ قوم نادر
بگفتہ کارِ او در گوش عثمانؔ
بہادر بود و خود در جنگ ماہر

۱۳۶۳ھ

اور اس کے نیچے یہ فارسی عبارت بھی اعلیٰحضرت ہی کے قلم سے تھی:

"ہر چہ خدماتِ بے لوثانہ برائے قوم و ملتِ خویش دادہ بود ضرور قابلِ ستائش وہم ایں امر بہ شکل یادگار او در قلوب آنہا خواہد ماند بہ تشکر و امتنان، علاوہ موروثی جانثارئ ملک و مال خدا او را غریق رحمت بکناد"

اشکہائے امجد

خیامِ ثانی[2] حضرت امجد حیدرآبادی نے بہادر یار جنگ کے سانحہ رحلت پر یہ دو عارفانہ رباعیاں کہیں ہیں ؎

(۱)

تجھ سے تھا وطن کا نام مرنے والے کیا کر گیا کام واہ، مرنے والے
لاکھوں نے پڑھی تیرے جنازہ کی نماز تجھ پر لاکھوں سلام مرنے والے

---

[1] یہ لقب اعلیٰحضرت ہی کا نتھا جو اُن کے استاد اور وقت کے امام فن شاعر جلیل مانک پوری ثم حیدرآبادی (المخاطب بہ فصاحت جنگ) نے عطا کیا تھا۔ [2] اس خطاب سے حضرت امجد کو خلدون عصر علامہ سید سلیمان ندوی رحمت اللہ علیہ نے نوازا تھا۔

(۲)

اللہ رے بہادری بہادر خاں کی | اپنی ہر چیز حق کی خاطر دے دی
اپنا سب کچھ خدا کی رہ میں دے کر | اک جان بچی تھی وہ بھی آخر دے دی

تحقیق مرگ کا مطالبہ

بہادر یار جنگ کی رحلت کے بعد مسلمانوں نے مولوی ابوالحسن سیّد علی ایڈوکیٹ کو جو مجلس کے پُرانے اور مدبر خادم تھے اپنا صدر منتخب کیا، ان کے صدر بننے کے بعد عوام نے نواب صاحب کی موت کی تحقیقات کا مطالبہ کیا اور خود انھوں نے بھی اس کو پوری قوت سے اہل حکومت کے سامنے رکھا مگر حکومت کی طرف سے اُن پر خاموش رہنے کا دباؤ پڑا تو وہ اس میں باہمت ثابت نہ ہوسکے۔ اور اپنی بیماری کا بہانہ کر کے مجلس کی صدارت سے مستعفی ہو گئے۔

مولوی ابوالحسن سیّد علی راقم الحروف کے ہم محلہ بھی رہ چکے تھے۔ پھر نواب صاحب مرحوم کے تعلق سے، عمر کے غیر معمولی تفاوت کے باوجود ہم میں بے تکلفی اور باہمی اعتماد کا رابطہ قائم تھا، ان کے استعفےٰ کا حال سُن کر میں اپنے دو تین نوجوان احباب کے ساتھ مولوی صاحب کے گھر پہنچا اور ہم نے ان سے استعفیٰ واپس لینے پر زور دیا مگر آخر کار ان کا جواب یہ تھا کہ قوم کا مطالبہ نواب صاحب کی موت کی تحقیق کا ہے اور میں نے بھی اس کو اٹھایا مگر اب ایک "ایسا ہاتھ" درمیان میں آگیا ہے کہ جس کا مقابلہ میں نہیں کرسکتا، اس لئے میرا مجلس کی صدارت پر رہنا مناسب نہیں!

چنانچہ مولوی صاحب صدارت سے سبکدوش ہو گئے اور ان کی جگہ مولانا مظہر علی کامل نے لی جو نواب صاحب مرحوم کے مخلص دوست، اور بڑے نیک نہاد عالم اور خدا ترس وکیل تھے، مگر اپنی طبیعت کے لحاظ

سے رائے مشورہ سے زیادہ عملی سیاست کے اکھاڑے کے پہلوان بالکل نہیں تھے۔ ان کی صدارت پر آنے کے بعد "تحقیق مرگ" کا مطالبہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

عوام کا گمان

عوام کا گمان اس سلسلہ میں مختلف رہا، کسی نے نواب صاحب کی زہر رسانی اور موت میں حکومت وقت کا ہاتھ سمجھا، کسی کو گمان ایک خاص فرقہ کی کارستانی کا رہا، کسی کا قیاس تھا کہ برطانوی ریزیڈنسی پر اس کی ذمہ داری عائد ہے، پاکستان آکر راقم الحروف نے بعض سنجیدہ لوگوں کا یہ قیاس بھی سُنا کہ اس سانحہ میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم کے ایک خاص فرد کا ہاتھ تھا اور یہ ہاتھ لیاقت اللہ قریشی کے ہاتھ کے کے ذریعہ یہ کام کرگیا، واللہ اعلم

اس معاملہ میں اپنا مسلک مُبہم کو مبہم ہی رہنے دینے کا ہے اور انکشاف حقیقت کے لئے حشر کے انتظار ہی کا ہے۔

ظاہر وباطن کی جامعیّت

حُلیہ صحیح تنومند جسم، خوبصورت اور دل فریب قد بالا، سرخ وسفید رنگ متبسم کتابی چہرہ جس سے افغانیت کا دبدبہ اور مذہبیت کا نور نمایاں، گرداگرد خشخشی مگر بھری ہوئی داڑھی اور ترشی ہوئی موچھیں، دمکتی ہوئی پیشانی جس سے اقبال مندی ظاہر، نرگسی آنکھیں جن سے ذہانت، متانت، محبّت اور شفقت عیاں، پنجہ خوب مضبوط مگر نرم، انگلیاں متناسب اور نکیلی جو جفاکشی، قوت تحریر وتقریر پر شاہد، پاؤں سپاہیانہ اور رفتار پرشوکت۔

عموماً شیروانی اور سُرخ ترکی ٹوپی میں ملبوس رہتے، لیکن موسم گرما میں انگرکھا بھی پہن لیتے اور سرما میں سر پر عمامہ بھی باندھ لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی جناح کیپ بھی اوڑھ لیا کرتے تھے، ہر لباس ان کو زیب دیتا تھا بلکہ ان کے جسم پر آکر لباس کو زینت ملتی تھی۔

قائد ملّت پر خدا کی عنایتیں ہی عنایتیں تھیں، وہ پاکیزہ سیرت بھی تھے اور باجمال بھی، فقیر دل بھی تھے اور ڈیل ڈول کے پُرشکوہ بھی، ہزاروں کے مجمع میں ان کی شخصیت نمایاں رہتی تھی، بشرہ اتنی ہمہ گیر کیفیات کا مظہر تھا کہ مفکرین میں ہوتے تو تفکر کی اعلیٰ علامتیں یہیں پڑھی جاسکتی تھیں، پاک بازوں کے گروہ میں ہوتے تو جمال رحمانی کے آثار یہیں جلوہ گر رہتے۔ "خاکساروں" اور "رضاکاروں" کے درمیان ہوتے تو جفاکشی اور عسکریت کا جلال اسی چہرہ پر زیادہ نمایاں رہتا،

خطیب کی حیثیت سے ظاہر ہوتے تو انھیں کے چشم و ابرو، اپنے الفاظ کی سب سے زیادہ وضاحت، اور اپنے کنایات کی سب سے بڑھ کر تشریح کرتے دِکھائی دیتے تھے۔

دماغی صلاحیتیں

مطالعہ کی وسعت تو انسان کے بس کی بات ہے لیکن اس سے پورا پورا استفادہ اور افادہ ہر ایک کے اختیار میں نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مطالعہ کا تعلق اپنی محنت و جانفشانی سے ہے لیکن اس سے حقیقی فائدہ اٹھانا اور دوسروں کو بہرہ ور کرنا تمام تر دماغی صلاحیتوں پر منحصر ہے اور دماغی خوبیاں عطیہ ہوتی ہیں اسی غیر اختیاری شئے کے نہ ہونے اور ہونے کی وجہ سے ایک بہت پڑھا لکھا پروفیسر بھی بعض دفعہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اور ایک نسبتاً کم مطالعہ اُستاد، شاگردوں کے حق میں اس سے زیادہ مفید ہوتا ہے ـــــ بعض لوگ صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن مطالعہ کی کمی ہوتی ہے، بعض پڑھتے بہت ہیں لیکن اس عطیہ ربانی سے محروم رہتے ہیں، وہ بڑا ہی خوش نصیب انسان ہے جس میں یہ دونوں صفات جمع ہو جائیں۔ بہادر یار جنگ مرحوم ایسے ہی خوش قسمت افراد کی ایک مثال تھے۔

دَرسی تعلیم جتنی کچھ ہوئی یا ہو سکی اس کا حال معلوم ہی ہو چکا، اس کے بعد جو کچھ خانگی طور پر اساتذہ سے پڑھا اور اپنے طور پر معلومات بڑھائیں وہ بہر حال اتنی تو نہ تھیں کہ سب علماء و ماہرین سے زیادہ ہوں لیکن یہاں جتنا علم تھا اس سے زیادہ اس سے نفع اٹھانے اور نفع پہنچانے کی صلاحیت تھی، وہ غیر معمولی صلاحیت تھی۔

مرحوم کی چند خاص دماغی خوبیاں تھیں، جو بہت کم ایک جگہ پائی جاتی ہیں، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، جب ایک دفعہ کوئی کتاب نظر سے گذر چکتی تو برسوں نہ بھولتے تھے، یہی وجہ تھی کہ تاریخ اسلام کا مطالعہ چھوٹے ایک عرصہ ہو چکا ہوتا لیکن اب بھی جب واقعات بیان کرتے اور کتابوں کے حوالے دینے لگتے تو سننے والوں کی عقل دنگ رہ جاتی، حافظہ کی یہ خوبی مرحوم کے لئے نعمت غیر مترقبہ تھی، کیونکہ سیاسی اُلجھنوں، اور کام کی کثرت ان کو کوئی کتاب ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھنے کا موقع مشکل ہی سے دیتی تھی۔ دوران تقریر اقبال کے خصوصاً اور رومی، جامی۔ داغ۔ غالب۔ ذوق وغیرہ کے اشعار عموماً جس آسانی اور برجستگی کے ساتھ مرحوم کی زبان پر رواں ہوتے تھے اس کا اصلی سبب ان کی غیر معمولی قوّت حافظہ ہی تھا، اس کم یاب صفت سے مرحوم کو یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ جب وہ کسی شخص کو ایک بار دیکھ لیتے اور اس کا نام پوچھ لیتے تو پھر چاہے کتنی ہی مدّت بعد اس سے ملاقات ہوتی ایسا پہچان جاتے گویا روزمرہ کا ملاقاتی ہے، حیدرآباد کے گوشہ گوشہ میں اور ہندوستان کے طول و عرض میں ان کو بار بار گھومنا پھرنا پڑتا، جب وہ ایک آدھ مرتبہ کی شناسائی پر لوگوں سے قدیم ملاقاتیوں کی طرح ملتے تو ان کے قلوب مسخر ہو جاتے، اور وہ یہ سمجھنے لگتے کہ مرحوم کو ان کا بڑا خیال ہے اور بہت چاہتے ہیں، مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی ایسے شخص سے ملتے تو "السلام علیکم" کے ساتھ ہی اس کا نام لے لیتے اور وہ ان کا بندۂ بے دام ہو جاتا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کا دماغ بڑا "اخاذ" تھا موٹی موٹی کتابیں جب پڑھ چکتے تو بڑی آسانی سے ان کا اصل منشاء اور رُوح ان کے ذہن

میں کھچ کر آجاتی، دماغ کا یہ خاصہ اتنا گراں قدر ہے کہ اس کے بغیر کوئی آدمی میدان علم وسیاست میں قدم رکھ کر کامیابی سے چل نہیں سکتا یہ صفت حافظہ کی خوبی کے ساتھ ملکر نور علیٰ نور ہوگئی تھی، برسوں پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کا ذکر آتا تو ان کا خلاصہ بیان کرنا یا ان کے مرکزی نکات بتا دینا مرحوم کے لئے ایک آسان بات تھی ـــــ "دارالسلام" میں ایک بار تقریری مقابلہ تھا جس میں یہ راقم بھی ایک مقرّر کی حیثیت سے شریک تھا۔ چند کتابیں سیرت اور تاریخ اسلام سے متعلق انعام کے لئے لائی گئی تھیں، قائد ملتؒ صدارت فرما رہے تھے۔ انعامی کتابوں پر جو نظر پڑی تو فرمایا "بہت اچھا انتخاب ہے، یہ کتابیں بارہ سال قبل میری نظر سے گذر چکی ہیں" اور پھر ہر ایک کتاب کا نام لے کر فرمانے لگے کہ اس کی فلاں فلاں بات خوب یاد رکھنے کے قابل ہے۔ ہم لوگ اس گفتگو سے دنگ رہ گئے۔

فنونِ سیاست اور معاشیات کے مسائل کس قدر ادق اور پُر پیچ ہیں ایک اچھے اُستاد کو بھی ان مسائل کے سمجھانے کے لئے غور وفکر اور طریق تعبیر کا بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے، پھر بھی مشکل سے تفہیم کا حق ادا ہوتا ہے، لیکن مرحوم نے ایسا "انصاذ" دماغ پایا تھا کہ مشکل سے مشکل کتاب، پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل پڑھتے تو اس آسانی وخوبی سے اُن کی حقیقت سے آگاہ ہوجاتے کہ حیرت ہونے لگتی ..... اور مزید حیرت کی بات یہ کہ اُن کے لئے ان مسائل کا پانی پانی کر کے بیان کرنا کچھ دشوار نہ رہ جاتا تھا، ایک واقعہ یاد آیا احمد خاں صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)، اِل، اِل، بی (علیگ) معاشیات کے چند معیاری طلباء میں سے ہیں، موصوف نے اپنا ایک کتابچہ (پمفلٹ) "ہندوستانی زر کے مسائل" نواب صاحب کی خدمت میں پیش

کیا اور چلے گئے، چند روز بعد پھر اُن کو ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو مرحوم نے خاں صاحب کی تعریف فرمائی، ان کی تفہیم کی داد دی اور بعض پیچیدہ مسائل زر پر اس طرح گفتگو فرمانے لگے جیسے کوئی ماہرِ فن بحث کرتا ہے ——— خاں صاحب کی یہ کتاب ان کی کافی دیدہ ریزی اور دقّت نظری کا نتیجہ تھی، اور واقعی "زر" کے مسائل ہوتے بھی ایسے ہی ادق ہیں لیکن مرحوم کی اس طرح بلا تکلف بحث سے خاں صاحب ساکت ہو کر رہ گئے۔

یہ تو ایک فن دان سے گفتگو کا ذِکر ہوا، عوام کے مجمعوں میں مرحوم سیاسیات اور معاشیات کی باریک باریک گرہیں اس طرح کھولتے کہ اہل علم ان کی سلاست تفہیم پر دنگ رہ جاتے اور عوام اپنی بساط کے موافق ان باریکیوں کو سمجھ لیتے تھے "تشریح اِصلاحات"، "اشتراکیت اور اِسلام" اور حیدرآبادی اور ہندوستانی سیاست پر بے شمار تقریریں مرحوم کی اس خوبی کی آئینہ دار ہیں، اور اس ہنر کا راز یہی تھا کہ ان کے اندر قوّت "آخذہ" بلا کی موجود تھی، ہر بات کی کنہ تک اور ہر واقعہ کی علت تک بہت جلد اور بڑی آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔

لیکن غور سے دیکھا جائے تو "قوّت آخذہ" ذاتی فہم کے لئے تو کافی ہے لیکن اخذ کردہ چیزوں کو مربوط شکل میں پیش کرنے کے لئے ذہن و دماغ کی ایک اور خوبی کی ضرورت ہے، اور وہ ہے "تحلیلی صلاحیت" ——— بڑے بڑے اہلِ علم مقرر بھی اپنے اظہارِ خیال میں اس وجہ سے ناقص و ناکام رہتے ہیں کہ ان کا دماغ خیالات کی صحیح تحلیل نہیں کر سکتا اور جب دماغ میں خیالات غیر مربوط اور غیر تحلیل شدہ ہوں تو اظہار میں بھی اُلجھاؤ کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے ——— مرحوم کے دماغ کا تیسرا خاص وصف "**تحلیلی صلاحیت**"

تھی — کسی عالمانہ تقریر یا حکیمانہ کتاب میں ایک دو باتیں ہی محفوظ کرنے کے لائق نہیں ہوتیں بلکہ کئی مسائل اور بیسیوں خیالات ہوتے ہیں، عالم یا حکیم اپنی تقریر و تصنیف میں چونکہ شرح و بسط کے ساتھ ہر مسئلہ کی وضاحت کرتا ہے اس لئے اس کا مافی الضمیر واضح ہو جائے تو تعجب کی کون سی بات ہے؟ لیکن جب اس تفصیل کا اجمال چند جملوں اور فقروں میں بیان کرنا ہو اور یہ شرط رہے کہ نہ اس کا وزن گرے، نہ منشاء فوت ہو تو اچھے اچھوں کی پیشانی پر بل آجاتے ہیں، اس کام کے لئے "تحلیلی دماغ" انتہائی ضروری ہے — مرحوم میں یہ وصف کامل طور پر موجود تھا، تقریر یا تحریر کے وسیع گلبن سے دو چار پھول ایسے چن لیتے جن سے اس کی رونق تھی اور ان کو ایک دلکش گلدستہ کی شکل میں پیش کر دیتے تھے. دو، دو گھنٹوں کی تقریروں کا پانچ دس منٹ میں لب لباب بیان کرنا، مرحوم کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا — آنکھوں دیکھا واقعہ سنیئے، مولانا آزاد سبحانی ہندوستان کے مشہور فلسفی اور دقیق مقرر گذرے ہیں. ایک مرتبہ حیدرآباد تشریف لائے. قیام نواب صاحب ہی کے ہاں تھا — نواب صاحب نے بطور خاص مولانا کی تقریر کا انتظام افضل گنج کی جامع مسجد میں جو شہر کی مرکزی جگہ ہے کروا دیا ایک کثیر اجتماع میں مولانا نے "وجود باری" پر اپنے انداز کی تقریباً ڈھائی گھنٹہ تقریر فرمائی، فلسفی اور پھر ایسا عنوان، خوب توضیح ہوئی، کافی تشریح کی گئی لیکن پھر بھی تھی تمامتر اصطلاحات سے بوجھل چند اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے سوا عوام کے پلہ کچھ نہ پڑا، تقریر ختم ہوئی تو مرحوم صدر جلسہ کی حیثیت سے اُٹھے اور فرمایا "میں پٹھان آدمی ہوں فلسفہ سے میرا کیا تعلق؟ میرے پاس دماغ نہیں صرف ایک تڑپتا ہوا

دِل ہے"۔ اس کے بعد فرمانے لگے "مولانا کی تقریر بہت معلومات آفرین تھی۔ مولانا کا منشاء یہ تھا...." تقریباً ۱۵ منٹ میں "وجود باری" کی ایسی عام فہم اور مدلّل توضیح فرمائی کہ عالم و عامی ہر ایک کو لُطف آ کر رہا اور کوئی بات اپنی طرف سے بیان نہیں کی بلکہ مولانا ہی کی تقریر کا خلاصہ اور انھیں کی مثالوں کا آسان پیرائیہ میں اعادہ فرما دیا — اور تو اور خود مولانا بہادر یار جنگ کی تقریر کے دوران جھومتے جاتے تھے اور بیخودی کے عالم میں ہاتھ ٹپک ٹپک کر تحسین و آفریں فرما رہے تھے[1] — یہ کیا چیز تھی؟ زورِ کلام کو چھوڑتے ہوئے اصل سبب وہی خیالات کا تجزیہ اور ان کا ترتیب کے ساتھ بیان، جس سے وقت کی بچت بھی ہوتی ہے اور مفہوم بھی کھُل جاتا ہے۔ اسی دماغی صلاحیت کی وجہ سے مرحوم کا تبصرہ ہر مقرر کی تقریر سے اور ہر مصنّف کی تصنیف سے وزنی اور سلجھا ہوا ہوتا تھا۔

اِن صفات کے سوا ایک اور دماغی خصوصیت بھی تھی جو ہر آن اُن کے عمل کی نزاکتوں سے ظاہر تھی، اس کو "قوّت فکریہ" سے تعبیر کیجیے یا "تدبّر" کہیے، بہرحال اسی کی وجہ سے مرحوم میدانِ سیاست کے ایک اعلیٰ شہسوار بن سکے تھے مرحوم کی فکر بہت عمیق اور صحیح ہوا کرتی تھی، حیدر آباد کو مرہٹوں کی یورش اور کانگریس کی عیاریوں سے بچانے اور ریاستی مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دِلانے کے لئے مرحوم نے جو خاکے بنائے وہ ان کی فکری قوّت کے شاہد ہیں، ہندوستان کے مشہور ترین سیاس

---

[1] ختم جلسہ پر مولانا عبدالجبار صاحب مرحوم (مفسر ریڈیو پاکستان) نواب سے ملے۔ نواب نے محبت سے معانقہ کیا اور فرمانے لگے "آپ نے عوام کا ایمان بچا لیا ورنہ وہ شکوک ہی میں رہ جاتے"۔

اور دنیا کے مسلمہ مفکرا ور مرحوم کے محبت آمیز الفاظ میں "گرگ باراں دیدہ" محمد علی جناح تک نے مرحوم کے اس وصف کی داد دی اور اعتراف فرمایا کہ

"بڑے بڑے نازک مواقع پر نواب صاحب میرے لئے معین و رہبر ثابت ہوئے ہیں"

یہ مرحوم کی قوتِ فکریہ کی پختگی ہی تھی جس نے ان کی سیاسی زندگی کو غلط اقدام اور پسپائی سے پاک رکھا اور اس اعتبار سے بہادر یار جنگ اپنے پیش رو قائد مولانا محمد علیؒ جوہر سے زیادہ کامیاب رہے۔

وسیع مطالعہ یہ بتایا جاچکا کہ مدرسہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد مرحوم نے صرف تفسیر، فقہ، حدیث اور عربی باضابطہ طور پر مولانا شمسی صاحب (صاحب تفسیر شمسی) اور مولوی سعدۃ اللہ صاحب مدرس مدرسہ دار العلوم سے پڑھی تھی، لیکن علم کے بے پایاں ذوق نے مرحوم کو مختلف علوم سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ان پر کافی عبور بھی عطا کیا۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی جو مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور قریبی دوست ہیں، ان کی علمیت کے متعلق یوں رقمطراز ہیں۔

"مرحوم کی طالب علمانہ زندگی بہت جلد ختم ہوگئی اور وہ ابتدائی عمر ہی میں دنیا کے دھندوں میں پھنس گئے، یہی وجہ ہے کہ وہ علمی اداروں کی باضابطہ تعلیم یا امتحانوں کی کامیابی کی اسناد نہیں رکھتے تھے، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ علم محض مدرسوں یا کالجوں میں حاصل نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ مکتب اور مُلّا، انسان کی صلاحیتوں کو جو اکتسابِ علم کے لئے فطرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہیں

نقصان پہنچاتے ہیں، چنانچہ اقبال نے اِسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتے ہیں:

اے کہ در مدرسہ جوئی ادبِ دانش و ذوق
نہ خرد بادہ کس از کارگہ شیشہ گراں

تاریخ عالم میں اور خصوصاً مشرق کی تاریخ میں اکثر علماء نے باضابطہ مدرسوں میں نہیں بلکہ محض اپنی ذاتی کوششوں سے علم و فن میں کمال حاصل کیا مولوی محمد بہادر خاں مرحوم کا شمار بھی اِسی گروہ میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے فطری ذوقِ علم کی تشفی خود اپنے طور پر مطالعہ سے کی اور علم کی جن شاخوں سے ان کو دلچسپی تھی، ان میں اس قدر یدطولیٰ حاصل کیا کہ باضابطہ اُستاد رکھنے والوں سے بدرجہا آگے بڑھ گئے۔ مطالعہ کرتے تھے، مشاہیر علماء سے بحث کرتے تھے اور خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے، اکتساب علم کے یہی تین ضروری اجزا ہیں اور مرحوم ان تینوں سے بہرہ ور تھے ان کا ذاتی کتب خانہ معدودے چند کتب خانوں میں سے ہے جن میں مختلف علوم و فنون کی معیاری اور نایاب کتابیں موجود ہیں۔ انھوں نے ان میں سے اکثر کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور ان کتابوں پر جا بجا ان کے مطالعہ کے نشانات موجود ہیں بلادِ اسلامیہ کے سفر میں اور ہندوستان کے متعدد دوروں میں ان کی ملاقات بڑے بڑے علماء سے ہوئی اور اپنی ذکاوت اور ذہن رسا کی بدولت وہ ان علماء کی گفتگو اور بحث مباحثہ

سے بہترین طور پر استفادہ کر سکے۔ ان کی قوّتِ فکر کا اظہار ان کی تقریروں اور علمی صحبتوں میں اچھی طرح ہوتا تھا۔ غرض ایک عالم کے لئے جتنی ضروری صفات ہیں وہ ان میں کافی موجود تھیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مختلف النوع کمالات میں ان کے علمی کمالات کو بھی جگہ دینا لازمی ہے۔

دنیائے اُردو کے تو وہ سب سے بڑے خطیب تھے۔ اس لئے ان کی اُردو دانی کا تذکرہ کرنا تحصیل حاصل ہے عربی اور فارسی میں بھی اُن کی مہارت مسلمہ تھی، اور تفسیر کا انھوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا اور روزانہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں تفسیر کا درس دیا کرتے تھے، تفسیر اور حدیث میں ان کی معلومات جس پائے کی تھیں اس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جو "درس اقبال" میں شرکت کرتے تھے[1] سچ پوچھیے تو جس درس میں وہ شرکت کرتے تھے، اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا تھا، حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے، بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر "نمک مرچ" لگانا شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دنیا بھر کے مسائل پیش نظر ہو جاتے"۔

(اخبار تنظیم "قائد ملت نمبر" مولوی بہادر خاں مرحوم و مغفور ایک عالم کی حیثیت سے)

---

[1] اس کا اندازہ تو وہ لوگ کر سکتے ہیں جو "درس تفسیر" میں شریک ہوتے تھے۔ "درس اقبال" میں تو ضمناً اس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ (مولف)

وسعت علمی سوائے مذہبی مطالعہ کے مرحوم نے کوئی اور فن اپنی خواہش سے نہیں سیکھا، بلکہ مسلمانوں کی ضروریات ان کو اس فن کے مطالعہ پر مجبور کرتی رہیں اور چونکہ صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی عطا ہوتی تھیں اس لئے جس فن کا رُخ کیا اُس میں ماہرانہ رنگ دِکھا گئے، سیاسیات کا مطالعہ تبلیغ مذہب کے زمانے میں بہت کم بلکہ قابل نظرانداز تھا! ہاں وید، بھگوت گیتا اور بائبل (انجیل)، سے اس وقت بھی خوب واقف تھے۔ فرماتے تھے کہ گاندھی جی چاہتے ہیں کہ وید (جن کی حقیقت اب ثابت ہو چکی ہے) ہندؤں کے سامنے نہ رہیں بلکہ صرف بھگوت گیتا ہی کے ورد ہوں؛ بھگوت گیتا میں چونکہ فوجی تربیت اور جہاد وغیرہ سے متعلق مسائل ہیں اس وجہ سے وہ تو ہندؤں کو پڑھائی جائے لیکن وید مطالعہ میں نہ آنے پائیں۔ مرحوم نے ایک دفعہ پونا میں خود ہندؤں کی ریسرچ کمیٹی کے کاموں کا معائنہ فرمایا، جہاں انھیں بتایا گیا کہ تحقیق سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وید دراصل افسانے ہیں۔ غرض جب تبلیغ کا میدان چھوٹا اور بحر سیاست کی شناوری کرنی پڑی تو لازماً مرحوم نے اس فن سیاسیات کا غائر مطالعہ کیا۔ بنیادی اور مروجہ سیاسیات کی ساری اہم کتابیں دیکھ ڈالیں پھر جب دیکھا کہ اشتراکیت کی مسموم ہوا مسلمانوں کے دماغ کو ماؤف کر رہی ہے تو اشتراکیت اور دوسرے معاشی نظاموں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا، ہیگل، مارکس، انگلز کی کتابیں پڑھیں اور "اشتراکیت" کے تدارک کے لئے "اشتراکیت اور اسلام"، کے عنوان سے تقریریں شروع کر دیں، خود جامعہ عثمانیہ میں "جلسہ میلادالنبیؐ" کے سلسلے میں اس عنوان پر فی البدیہ[1] ایسی علمی

---

[1] بالکل فی البدیہ۔ ہوا یہ کہ بہادر یار جنگ تو سیرت النبی پر ہی تقریر کرنے کے لئے آئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ معرکہ کی تقریر فرماتے کیونکہ یہ بہت خاص جلسہ تھا، صدارت اعلیٰحضرت کے بھائی

تقریر کی کہ سب قائل ہو گئے۔

اُردو ادب کے متعلق مرحوم کی معلومات ایک اہل فن سے کم نہ تھیں، اردو کا کوئی شاعر، مضمون نگار، افسانہ نویس اور ناول نویس خواہ قدیم ترین ہو یا جدید ترین مرحوم کی تنقیدی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھا، اور اردو کا بیشتر مطالعہ ابتدائی زندگی ہی میں ہوا تھا۔ لیکن تقریروں اور گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ اس وقت بھی اُردو ادب میں مرحوم کو کیسی اچھی نظر حاصل تھی۔

فلسفہ و نفسیات سے بھی نواب صاحب نے کافی واقفیت حاصل کرلی تھی، اس کا ثبوت قرآن مجید کی تفسیر سے ملتا تھا، کیونکہ ہر آیت کی تفسیر

نواب بصالت جاہ کی تھی "اسلام اور سود" کے موضوع پر تقریر ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبہ معاشیات کی تھی، سیرت پر ایک تقریر حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی تھی۔ مگر نواب صاحب ابھی جلسہ گاہ پر پہنچے نہ تھے کہ چند اشتراکی ذہن کے طلباء نے ان کی تقریر کو ناکام بنانے کی سازش کی، انھوں نے طے کیا کہ ان سے عقیدت مندانہ طور پر یہ عرض کیا جائے کہ "اشتراکیت اور اسلام" کے موضوع پر آج کچھ بیان فرمائیں، ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے علمی ماحول میں وہ ناکام رہیں گے۔ چنانچہ یہی کیا۔ نواب صاحب کے آتے ہی محمد شعیب نامی اشتراکی طالب علم نے بڑھ کر ان سے یہی درخواست کی اور قائد ملت نے متبسم ہو کر فرمایا "بہت اچھا"۔ چنانچہ مولانا گیلانی کی مختصر تقریر کے بعد بہادر یار جنگ اُٹھے اور ڈیڑھ گھنٹہ ایسی پُر مغز علمی اور مدلل تقریر کی کہ اہل سازش کو اپنی حرکت پر نادم اور متاسف ہونا پڑا اور سب پروفیسروں نے ان کی علمی عظمت کا اعتراف کیا، ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی تو فرطِ محبت سے اُٹھ کر اپنے قدیم دوست سے لپٹ گئے اور فرمایا۔

"نواب ہم تو تم کو عوام کا اُستاد سمجھتے تھے مگر تم تو ہمارے اُستاد ہو واہ وا، واہ وا، ہماری آنکھیں کھُل گئیں"۔

یہ میں عینی شہادت پیش کر رہا ہوں، میں قریب ہی کھڑا تھا اور سُن رہا تھا۔

مختلف نقاط نظر سے بیان فرماتے تھے، خصوصاً گذشتہ قوموں کے واقعات سے ان کی نفسیاتی کمزوریوں یا خوبیوں کی تحقیق اور ان کا حالیہ قوموں پر انطباق بڑے ہی ماہرانہ انداز میں فرمایا کرتے تھے۔

مرحوم کا کتب خانہ جس کا ذکر ڈاکٹر رضی الدین صاحب نے بھی فرمایا ہے۔ اعلیٰ علمی کتابوں سے مملو ہے، لیکن اس وسیع کتب خانہ کا بڑا حصّہ تفاسیر اور دیگر مذہبی کتب پر مشتمل ہے اور اکثر عربی زبان میں ہیں، بقیہ حصّہ میں ادب سیاسیات، معاشیات وغیرہ کی کتابوں کا ذخیرہ ہے —— سیاسیات، معاشیات اور مذہبیات پر جو بھی معیاری کتاب نکلتی مرحوم ضرور فراہم کر لیتے تھے۔

قدرت کی جو نوازشیں مرحوم پر رہیں، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر چیز وہبی ہی تھی، کسب کو کوئی دخل ہی نہ تھا، مرحوم نے نہ صرف علم بلکہ ہر چیز نہایت محنت و مشقت سے حاصل کی تھی البتہ صلاحیتیں چونکہ بہت اعلیٰ تھیں نتائج بھی عام معیار سے زیادہ پر شکوہ برآمد ہوئے۔ چالیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے، خصوصاً ایک تنومند پٹھان کے لئے تو یہ جوانی ہی کی عمر ہے، لیکن اسی کثرت مطالعہ کی وجہ سے تین چار برس سے عینک بھی لگ گئی تھی۔ باوجود عملی مصروفیتوں کے مطالعہ کا ذوق کہیں کم ہوتا ہی نہ تھا اور ذخیرہ علم میں اضافہ کا خیال ہمیشہ لگا ہی رہتا تھا۔

مطالعہ کا طریقہ مرحوم کے مطالعہ کا ایک خاص انداز تھا، یہ نہ تھا کہ جو کتاب ہاتھ لگ گئی۔ بس پڑھنے لگ گئے بلکہ طرز یہ رہا کہ ایک سال کے لئے کوئی ایک فن منتخب کر لیتے اور اس پر جتنی کتابیں مل سکتیں یا پڑھ سکتے تھے خوب غور سے پڑھتے، لیکن اس میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ پہلے اصول اور نظریوں کی کتابیں

دقتِ نظری سے دیکھ ڈالتے پھر اطلاقی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے بجز ان دنوں کے جب حیدرآباد سے باہر ہوتے، مطالعہ اپنے خاص وقت پر فرماتے تھے، البتہ قرآن اور تفسیر کا مطالعہ ابتداء سے اخیر عمر تک برابر جاری رہا، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مرحوم نے ہر فن کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت بنالی تھی ——— اسی تقابلی اور صحیح مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ جس محفل میں ہوتے یہی شمع بزم دکھائی دیتے اور حسن بیان کے علاوہ علمی اعتبار سے بھی سب پر چھائے رہتے تھے.

زبانوں کا ملکہ کسی زبان پر قابو حاصل کرنا ہر شخص کے لئے نہ صرف مشکل بلکہ اکثر صورتوں میں محال ہے، دماغ خواہ کتنا ہی تربیت یافتہ ہو، اس کا ہر ایک غیر مانوس زبان کو قبول کرنا ضروری نہیں راقم سوانح کے ایک اُستاد مولانا محمد عثمان جعفری پروفیسر دینیات، جامعہ عثمانیہ کے چند قابل ترین اساتذہ میں سے تھے. علوم مذہبیہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے! اور ان کو جدید علوم سے واقفیت کا شوق بھی تھا، چونکہ رائج علوم کا بڑا ذخیرہ انگریزی میں ہے اس لئے مولانا نے انگریزی زبان کے حصول کی کوشش فرمائی. خود فرماتے تھے کہ تقریباً ۱۲ سال تک وہ اس کی سعی فرماتے رہے اور مختلف اساتذہ سے درس لیتے رہے لیکن چوتھی پانچویں کتاب سے آگے بڑھ ہی نہ سکے، یہ ایک مثال پیش کی گئی، ورنہ یہ دقت عام ہے. البتہ بعض خوش بخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو ہر زبان بڑی آسانی سے آجاتی ہے، یہ چیز غیر اختیاری اور محض خداداد ہے ——— مرحوم قائد ملت کو اللہ تعالیٰ نے اس وصف سے بھی پوری طرح متصف فرمایا تھا، مرحوم بہت جلد کوئی زبان بھی سیکھ جاتے اور اس پر قابو پالیتے تھے، وہ منظر بھلایا نہیں جاسکتا جب تفسیر میں ایک روز بعض دیہاتی نومسلم

او۔ ایک تو وار دعرب نہ ملک تھے، لفضبہ ختم ہو چکی تو مرحوم دونوں سے مخاطب ہوئے۔ ادھر ان سے "تلنگی"؎۱ زبان میں کرم فرما رہے تھے، اُدھر عرب صاحب سے عربی میں گفتگو جاری تھی۔

زبان اُردو کا مرحوم نے بہت گہرا مطالعہ فرمایا تھا، اُردو ادب کی کوئی صنف ایسی نہ تھی جس کا اعلیٰ لٹریچر مرحوم کی تنقیدی نظر سے نہ گزرا ہو، نسلی پٹھان ہونے کی حیثیت سے گھریلو زبان تو ٹھیٹھ دکھنی تھی، لیکن اکتساب اور قدرت کی مدد سے زبان پر وہ قابو حاصل کر لیا تھا کہ اچھے اچھے اہل زبان عش عش کرتے تھے، زبان کے تعلق سے مرحوم پر شرر، آزاد اور ابوالکلام خاص طور پر اثر انداز رہے۔ مرحوم کی زبان اپنے اندر فصاحت و بلاغت، تشبیہ استعارہ و کنایہ کی پوری خوبیاں رکھتی تھی اور وہ بہت معیاری زبان بولتے تھے — مرحوم کو اُردو پر یہ قابو صرف گفتگو اور تقریر ہی کی حد تک حاصل نہ تھا بلکہ وہ اس زبان کے ایک اچھے ناقد بھی تھے۔ (اُن کی "انجمن ترقی اردو ہند" کے جلسوں کی تقاریر اس کی شاہد ہیں۔ مرحوم نے اپنی زبان و بیان کے ذریعہ ہندوستان کے طول و عرض میں اُردو کی جو خدمت انجام دی اس کے معترف مولوی عبدالحق صاحب (بانیٔ انجمن ترقی اُردو ہند) بھی تھے۔ مرحوم کی دِل نشیں اور اثر آفریں تقریریں جو ہندوستان بھر میں ہوتی رہیں ان سے نہ صرف اُردو کا ایک اعلیٰ معیار قائم ہوا بلکہ بہت سوں میں اُردو کی تحصیل کا ذوق اور اس کی خدمت کا شوق پیدا ہو گیا۔

ابتدائے سوانح ہی میں بتایا جا چکا کہ صرف عربی زبان ایسی تھی

؎۱ مملکت حیدرآباد کا وہ حصّہ جو تلنگانہ کہلاتا تھا اس کی ہندو آبادی کی زبان "تیلگو" یا "تلنگی" کہلاتی تھی، اب ریاست کا یہ حصّہ آندھرا پردیش میں شامل ہے!

جس کی تعلیم مرحوم نے اساتذہ سے باضابطہ پائی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ صرف عربی کتابیں بہ آسانی پڑھتے اور سمجھتے تھے بلکہ عربی بولنے پر بھی ان کو قدرت حاصل تھی مصر میں نحاس پاشاہ سے عربی میں جو بے تکلف گفتگو رہی، مصری اخبار اس کے شاہد ہیں۔ انتقال سے دو ڈیڑھ سال قبل جب مصر کے قونصل جنرل حیدرآباد آئے ہوئے تھے تو مرحوم نے بھی ان کے اعزاز میں ایک عصرانہ ترتیب دیا، مدعوئین میں علاوہ وزیر اعظم اور دیگر سرکاری حکام کے شہر کے تمام علماء و مشائخین کے نام بھی شامل تھے۔ اس اجتماع خاص میں مرحوم نے ایک پرجوش اور اثر آفرین تقریر عربی زبان ہی میں فرمائی جس سے سب لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور خود قونصل نے بھی جوابی تقریر میں اظہارِ تعجب کیا کہ "ہندوستان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو عربی میں اس بے تکلفی اور فصاحت کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں" جن لوگوں نے مرحوم کی یہ تقریر سنی ان کا بیان تھا کہ عربی تقریر میں بھی اُردو ہی کی روانی تھی۔

فارسی زبان کے متعلق مرحوم خود فرماتے تھے کہ میں نے "گلستان" جیسی ابتدائی کتاب بھی کسی سے نہیں پڑھی۔ البتہ عربی زبان نے مجھے اس کے حصول میں بڑی مدد دی۔ مرحوم کا خیال تھا اور غالباً بہت صحیح، کہ عربی زبان سیکھ لینے پر دوسری زبانوں کا حصول بہت ہی آسان ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک دفعہ ہنستے ہوئے فرمایا کہ "گو میں نے فارسی سبقاً کبھی نہیں پڑھی لیکن کوئی آجائے مقابلہ کے لئے" ۔ غرض مرحوم کے ذاتی مطالعہ اور ایران کے سفر نے ان کو اس زبان پر اچھا قابو عطا کیا تھا۔ فرماتے تھے کہ جب ایران گیا تو ابتداً جھجک محسوس کی۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ فارسی کے لئے میں اجنبی ہی ہوں میں نے پوری دلیری سے گفتگو شروع کر دی، مجھے خود حیرت رہی کہ چند ہی دنوں میں، میں بلا تکلف اظہارِ خیال کرنے لگا اور کبھی انگشت نمائی کا موقع بھی نہ آیا

بلکہ تحسین و تعریف ہی ہوتی رہی، چنانچہ جب غازی نادر پاشاہ نے مرحوم کی بے تکلف اور بامحاورہ گفتگو سُنی تو انھیں بڑا تعجب ہوا، اور اپنے مصاحبین سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے۔

"نواب صاحب در زبان فارسی خیلے خوب گپ می زنند[1]"

یہ واقعہ راقم نے خود مرحوم کی زبانی سُنا، اور ان کا ہر قریبی ملنے والا اس سے بخوبی واقف ہوگا۔

فارسی دانی کی ایک اور سند ملاحظہ ہو، خسرو دکن کی فارسی قابلیت مسلم ہے، ایک مرتبہ بہ الطاف شاہانہ انھوں نے مرحوم کو "خاصہ" سے سرفراز کیا گیا، مرحوم کے دولت کدہ "بیت الامت" میں مجلس اتحاد المسلمین کی عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا، جیسے ہی "خاصہ" پہنچا مرحوم نے سپاس کے طور پر چند جملے لکھ بھیجے، جو حضرت آصف سابع پر بہت اثر انداز ہوئے۔ دوسرے ہی روز اخبار "صبح دکن" میں (جس میں اکثر فرامین شائع ہوتے رہتے تھے) مرحوم کی وہ تحریر اپنے توصیفی جملوں کے ساتھ شائع فرمادی، ملاحظہ ہو:۔

نقل پرچہ رسید طعام برائے بہادر یار جنگ

تحریر بہادر یار جنگ بہ زبان فارسی

"فدوی جاں نثار موروثی از زلہ مایدہ ظل اللہ سرفراز گشتہ۔

ہمہ جاں نثاران سلطنت آصفیہ و وابستگانِ دامنِ حضرت شمس الملت والدین، کہ ارکانِ مجلس عاملہ صدر مجلس اتحاد المسلمین واخصِ خدمت گذارانِ حضرت بندگانعالی ہستند و جان و

---

[1] "گپ زدن" ایران کے محاورہ میں بامحاورہ گفتگو کرنے کو کہتے ہیں۔

مال خویش برائے حفاظت سلطنت آصفیہ اسلامیہ (حفظہا اللہ عن کل آفاتٍ وبلیتہ)، وقف کردہ اند، وایں وقت بہ کلبہ احزانِ ایں وفا شعار مصروف فکر و نظر بودند، از الطاف بیہاں بیہا بہرہ اندوز و مفتخر گشتند و بہ بارگاہِ جل وعلیٰ دعا گزار ہستند کہ

الٰہی آفتابِ عمر و اقبال شاہ دین پناہ ما کہ قلب او پیمانۂ لبالب زبادۂ حب رسول (علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات) است تا ابد تابان و درخشان باد آمین بحق طٰہٰ ویٰسین بہادر یار جنگ"

ف بہ بہ کہ او اگرچہ مثل ما از خاک شیراز و اصفہان نیست تاہم قلم او چہ خوب فارسی می نویسد، وایں سبب حصول ہم و نفس است (بہ حد خویش)، ورنہ بامحاورہ فارسی نوشتن یا گفتن خصوصاً برائے ابنائے دکن کارے دارد. وما ارادہ می داریم کہ حتی الامکان با او بہمیں زبان گفتگو کنیم وہم تحریر می نویسیم چراکہ مزاولت بہ السنہ دیگر ضروریست ورنہ ما با آنہا نا آشنا می باشیم - در آن حالیکہ مزاولت نہ باشد.

راست است کہ ذوق وشوق ہم چیزے ہست کہ ما اورا نظر انداز کردن نمی توانیم، خصوص آن وقت کہ جان دادن بہ جسم زبانِ مردہ پیش نظر باشد یا قلبی اتصال بوجہ چاشنی وہم شیرینی.

(صبح دکن مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۴۲ء)

یہ بھی بے ساختہ تعریف مرحوم کے چند بے تکلف جملوں کی

مرحوم کی انگریزی تعلیم صرف میٹرک کے درجہ تک ہوئی تھی، میدان سیاست میں اُتر آنے سے اس زبان کا حصول ناگزیر ہوگیا تو مرحوم نے کتابیں پڑھنی شروع کیں اور انگریزی سیکھ لینے کا مصمم ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال رہی اور بہت تھوڑے عرصہ میں اس زبان کو بھی اپنا لیا، بے تکلف سمجھنے اور بولنے لگے، ایک دفعہ مسز سروجنی نائیڈو کی ایک مختصر اُردو تقریر سُنی تو فرمایا: "اگر مسز سروجنی اُردو میں تقریر کرسکتی ہیں تو کیا محمد بہادر خاں انگریزی جیسی آسان زبان میں تقریر نہیں کرسکتا؟" —— قائد اعظم محمد علی جناح جیسی کچھ بامحاورہ، معیاری زبان بولتے تھے اور اُن کا لب ولہجہ جیسا کچھ پختہ تھا، سب کو معلوم ہے الٰہ آباد اور کراچی والے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ جلسوں میں قائد اعظم کی جو فصیح و بلیغ صدارتی تقریریں ہوتیں، ان کا فی البدیہہ ترجمہ اچھے اچھے انگریزی دانوں کے لئے بھی مشکل ہی تھا۔ یہ بہادر یار جنگ ہی تھے کہ قائد اعظم کے حکم پر ان کی تقریر ختم ہوتے ہی اس کا ایسا صحیح اور معیاری ترجمہ سُنایا کرتے تھے کہ سب ششدر رہ جاتے اور ہر محاورہ کا اس کے مترادف اُردو محاورہ میں اس بے تکلفی سے ترجمہ پیش کرتے تھے کہ بغیر دونوں زبانوں پر پورا قابو رکھے کسی سے ممکن ہی نہیں!

عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی کی ہستی محتاج تعارف نہیں، ان کی سحر کاریوں سے سرحد کے مسلمان گاندھی جی اور کانگریس کے سایہ کو اپنے حق میں سایہ ہما سمجھنے لگے تھے، مسلم لیگ کے بڑے بڑے مبلغین اس سحر کو توڑنے سے عاجز رہے، قائد اعظم کی حقیقت شناس نگاہوں نے بہادر یار جنگ کو اس کام کے لئے منتخب کیا، مرحوم اُردو کے اعلیٰ ترین خطیب سہی لیکن سرحد میں اس آلہ سے کیا کام چل سکتا تھا، معقول مشاہرہ پر ایک اہل زبان افغانی کو پشتو سیکھنے کے لئے مقرر فرمایا اور دو مہینے کی مشقت سے زبان سیکھ گئے اور پشتو

بولنے لگ گئے۔ اب سرحد کا قصد کیا اور وہاں مسلسل اس زبان میں تقریریں کیں. اور غفار خانی طلسم کو توڑ ڈالا، سرحد میں مسلم لیگ کے قدم مضبوط ہو گئے۔ یہ کوئی قصیدہ گوئی یا مبالغہ نویسی نہیں بلکہ حقیقت ہے، آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے جب سردار اورنگ زیب خاں مع دوسرے مسلم لیگیوں کے گلبرگہ سے گذر رہے تھے تو مسلمانان گلبرگہ نے ان لوگوں کا اسٹیشن پر پُرجوش استقبال کیا، چند نوجوانوں نے، جن میں راقم ہذا کے ایک معتبر دوست بھی تھے، بڑھ کر سردار اورنگ زیب خاں سے پوچھا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ ہمارے قائد ملت پشتو زبان بھی بولتے ہیں"

سردار صاحب نے جواب دیا:

"جی وہ بولتے کیا ہیں تقریر بھی فرماتے ہیں، سرحد میں انھوں نے اس زبان میں کئی تقریریں فرمائیں"!

ان زبانوں کے علاوہ دو مقامی زبانیں مرہٹی اور تلنگی سے بھی واقف تھے، تبلیغی کام چونکہ مرہٹواڑہ اور تلنگانہ کے مختلف گوشوں میں ہوا تھا، اس لئے مرہٹی اور تلنگی زبانوں سے واقفیت ضروری تھی لیکن یہ صرف اظہارِ خیال کی حد تک تھیں، مرحوم ان زبانوں میں لکھ پڑھ نہ سکتے تھے.

اس کے علاوہ دکن کی دیہاتی اُردو اس روانی اور بے تکلفی سے بولتے تھے اور دیہاتی محاوروں سے ایسے واقف تھے جیسے سچ مچ دیہاتی ہی ہیں اور شہر کی ہوا تک نہیں لگی ہے اس کا سبب بھی ان کی تبلیغی خدمات تھیں. ظاہر ہے بے چارے دیہاتیوں کے سامنے مرحوم کی فصاحت و بلاغت کیا کام دے سکتی تھی. اس لئے مرحوم نے انہی کی زبان اختیار کر لی تھی. لیکن کمال یہ تھا کہ جس وقت جس قسم کی زبان میں چاہتے ایسی گفتگو فرماتے —

گویا دوسری زبان سے واقف ہی نہیں ہیں چنانچہ مجلس اتحاد المسلمین کے یادگار سالانہ جلسہ جالنہ (ضلع اورنگ آباد) میں مرحوم نے اسی دیہاتی زبان میں اختتامی تقریر فرمائی تھی ـــــ دیہاتی ہزاروں کی تعداد میں جمع تھے اور انھیں سیاست کا درس دینا تھا مجلس کے مختلف مقررین نے اچھی اچھی تقریریں کیں، لیکن پہلے تو سیاسی مسائل مشکل پھر چاہے کتنی ہی سلیس زبان ہو دیہاتیوں کے لئے دقت طلب ہی تھی، اسی وجہ سے مرحوم نے "حیدر آباد کی سیاست" پر تقریباً ڈھائی گھنٹہ دیہاتی اردو میں تقریر فرمائی، حیدر آباد کی اجمالی تاریخ، حکومت کے نقائص، کانگریس کی ریشہ دوانیاں اور مجلس کا مقصد، سب ہی مسائل آگئے لیکن لطف یہ کہ محاورے دیہاتی تشبیہیں دیہاتیوں کے مذاق کی اور لب ولہجہ بھی ٹھیٹھ انہیں کا رہا۔ اور روانی، اور طرز تفہیم ویسا ہی انوکھا اور دل نشین جو مرحوم کا خاص امتیاز تھا سارے پڑھے لکھے دنگ تھے اور معترف کہ قیادت ایسی ہی جامع ہستی کو زیب دیتی ہے! جب جلسہ ختم ہوا تو دیہاتیوں کے چہروں پر خوشی کھیل رہی تھی پیشانیوں سے سیاست فہمی کے آثار نمایاں تھے اور آپس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں، سمجھ گئے کہ حکومت کس ڈگر پر چل رہی ہے اور قائد ملت کون سی راہ بتا رہے ہیں! ع

این سعادت بزور بازو نیست

اس اجلاس میں چودھری خلیق الزماں اور دوسرے لیگی زعماء بھی شریک تھے۔ یہ بھی میرے عینی مشاہدہ کی تفصیلات ہیں۔

طبعِ شاعرانہ مرحوم شعر گوئی کا معیاری سلیقہ رکھتے تھے مگر اس سے عمداً گریزاں رہے، خود فرماتے تھے کہ "میں بالارادہ اس جذبہ کو دباتا ہوں کیونکہ شاعر بالعموم عمل سے دور ہوتے ہیں اور مجھے کچھ کام

کرنا ہے"۔ پھر بھی جب یہ جذبہ غالب آجاتا تو فی البدیہ کچھ کہہ جاتے تھے، فرماتے تھے کہ "بالعموم میرا ذہن اس وقت شاعری کرنے لگتا ہے جب میں موٹر میں بیٹھا ہوتا ہوں، ورنہ اور اوقات میں تو اس کی فرصت بھی نہیں ملتی"۔

ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مرحوم کی ایک ہی نعت معلوم ہے مگر شاہکار ہے جو آغاز کتاب پر درج ہو چکی اور جس کا مطلع بلند یہ ہے ؎

"اے کہ ترا سر نیاز حدِ کمال بندگی
اے کہ ترا مقام عشق قرب تمام عین ذات"

بعض دفعہ ماحول خود کہلواتا تھا، چنانچہ مملکت حیدر آباد کا یادگار "یوم خود مختاری" کا جلسہ ہو رہا تھا مجلس کے ایک مخلص کارکن مولوی سید محمد قاسم رضوی بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (جو بعد کو سقوط حیدر آباد کے وقت آخری صدر مجلس اتحاد المسلمین تھے) نے ایک فی البدیہ رباعی[1] قائد ملت کی خدمت میں پیش کی یہ ایک یاس انگیز رباعی تھی میں قائد ملت کے قریب ہی بیٹھا تھا، دیکھا کہ قائد ملت اس رباعی کو پڑھ کر مسکرائے اور فوراً جیب سے قلم نکال اسی کاغذ کی پشت پر اس کا فی البدیہ قائدانہ جواب اسی بحر اور اسی قافیہ ردیف میں لکھدیا۔

کیوں اپنا قفس دیکھ کے ناشاد ہے تو
مایوس جو ہو گیا تو برباد ہے تو
گر دل ترا آزاد ہے اے صیدِ قفس
آزاد ہے، آزاد ہے، آزاد ہے تو

اسی طرح ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے یہ قطعہ بڑے موثر انداز میں

---

[1] رباعی پوری مجھے یاد نہیں، اس کا دوسرا شعر البتہ یہ تھا
"پنچی دو میاں مٹھو" تو کہہ لیتا ہے
آزادی کی بھولی ہوئی اک یاد ہے تو

ان کی زبان سے نکلا تھا۔

دہکتی ہوئی اک انگیٹھی ہوں یا دل
جہاں فسردہ کو گرما رہا ہوں
سُنا دو یہ خاشاک باطل کو جاکر
سنبھل جائیں میں آگ برسا رہا ہوں

ایک دفعہ اپنی اعلیٰ خطابت پر ناز کیا تھا:۔

آگاہ رموزِ دین فطرت ہوں میں
کچھ مجھ سے سُنو "لسان اُمت" ہوں میں
میں خطبہ سرا نہیں تو سونی ہے بزم
شاہنشہِ اقلیمِ خطابت ہوں میں

مرحوم کے "شاہنشہ اقلیم خطابت"، ہونے میں کیا کلام تھا، اور اس حیثیت سے یہ رُباعی محض اظہارِ حقیقت کی حامل تھی، تعلیٔ شاعرانہ سے پھر بھی گریز تھا، لیکن بہ ہر حال یہ بات شان عبدیت کے خلاف ہی تھی کیونکہ "عطا" کی جگہ "استحقاق" کی بو آرہی تھی، معاً کہہ اُٹھے:۔

دولت کو جہاں کی آنی جانی سمجھو
عزّت کو خدا کی اک نشانی سمجھو
اتراؤ نہ اپنی خوش بیانی پر خُلق
اس کو بھی خدا کی خوش بیانی سمجھو

ضمیر کی آواز پر کان کیسے لگے ہوتے تھے کہ شاعری میں بھی فخر کی کھٹک خطرہ کی گھنٹی کی طرح چونکا دیتی تھی ــــــ مرحوم خُلق تخلص فرماتے تھے:

مسلم لیگ کے سلسلہ میں بلوچستان کے دورہ پر گئے ہوئے تھے، واپسی سفر پر ارباب محمد اکرم خاں صاحب کو ۱۵ر جولائی ۱۹۴۲ء کے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جو فی البدیہ شعر آپ کے باغ کی تعریف میں کہے تھے افسوس کہ ان میں اضافہ نہ کر سکا، اپنی یادگار کے طور پر ان کو ذیل میں درج کر رہا ہوں۔

باغِ جنت کو رشک آجائے — باغ ارباب کو اگر دیکھے
دلکشی یہ کہیں نہیں دیکھی — باغ ہم نے بھی بیشتر دیکھے
کہیں نرگس لڑا رہی تھی آنکھ — کہیں خنداں گلاب تر دیکھے
ایک دنیائے رنگ و بو دیکھی[۱]

یہ اشعار سہل ممتنع کی ایک مثال ہیں۔

بہرحال اسی طرح بعض موقعوں پر کچھ کہہ دیتے، لیکن نہ کبھی کہنے کا پہلے سے اہتمام ہوتا نہ بعد میں اس کی حفاظت کا خیال؛

قلبِ مومن

اس مضبوط اور خوبصورت حصار کے اندر، جسے بہادر خاں کا جسم کہتے تھے، ایک عالیشان قصر تھا جس میں ہر طرف ایمان کا نور بچھا ہوا تھا۔ بہادر یار جنگ کی بے کلاہ بادشاہت کا راز ان کے دل کی جاذبیت تھی جو ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

"تشکر" ان کے قلب کا ایک وصف اور "امید و رجاء" دوسری صفت تھی، اللہ تعالیٰ کی ذات پر ان کو بڑا بھروسہ تھا، وہ کٹھن سے کٹھن مرحلوں میں سراسر متوکل نظر آئے۔

---

[۱] مکاتیب بہادر یار جنگ مکتوب (۲۱۶) شائع کردہ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی۔

پٹھان ہونے کی وجہ سے ان کو بے حد جذباتی ہونا چاہیئے تھا مگر
ان کو اپنی طبعی جذباتیت پر اتنا قابو حاصل تھا کہ وہ ہمیشہ پیکر
اعتدال ہی دِکھاتی دیئے۔

ایک واقعہ بطور مثال سُنئے:۔

شہر حیدر آباد کے ایک محلہ میں جس کا نام دھول پیٹھ تھا ہندو مسلم فساد خود ہندوؤں کی زیادتی سے ہوا، اس میں بہادر یار جنگ کے بعض قریبی رشتہ دار مرہٹوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، مسلمان پہلے ہی سے بپھرے ہوتے تھے اب اور بھی جوش میں آ گئے اور انھوں نے ہتھیار سنبھال لئے، مسلمانوں کی اس انتقامی آگ کو فرو کرنا حکومت کے بس سے باہر تھا، خود اعلیٰحضرت نے بہادر یار جنگ سے سفارش کی وہ اس وقت مسلمانوں کو سنبھال لیں ورنہ ساری ریاست فسادات کی لپیٹ میں آجائے گی۔
بہادر یار جنگ گھر سے نکلے، سر بکف دھول پیٹھ پہنچ گئے اور غیض وغضب سے بے قابو مجمع میں گھُس کر اُن کو اُن کے جذبات کے خلاف بات ماننے پر مجبور کر دیا، ہو سکتا تھا کہ اس وقت مسلمان خود ان پر ٹوٹ پڑتا مگر نہیں ان کی دلیری اور جادو بیانی کے آگے سب کی گردنیں جھک گئیں، تلواریں نیام میں اور برچھوں کی انی زمین میں دھنس کر رہ گئی، مرحوم نے کڑک کر کہا "میرے سامنے منتشر ہو جاؤ اور اپنے اپنے گھر چلے جاؤ" سب منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

یہ حیرت انگیز منظر فسادی ہندو اور امن پسند غیر مسلم بھی دیکھ رہے تھے، حیدر آباد کی باوفا غیر مسلم خاتون مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی آنکھ سے یہ سب کچھ دیکھا اور بعد کو بہادر یار جنگ سے جنھیں وہ اپنا "فرزند دلبند" بھی بڑے فخر و محبت سے کہتی تھیں، کہنے لگیں۔

"میں نے امن وسلامتی کی حالت میں اسٹیج کے لیڈر اور مقرر

تو بہت دیکھے ہیں مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور جوش سے
بپھرے ہوئے مجمع کو قابو میں لانے والا لیڈر اور مقرر میں نے
آج ہی دیکھا۔"

لیکن یہی ضابطہ ہستی کسی غریب کی تکلیف کو محسوس کر لیتی تو موم کی طرح پگھلنے لگتی تھی، ایک واقعہ اس رنگ کا بھی سُنیے:۔

پروفیسر غلام دستگیر رشید (نظام کالج) ایک مرتبہ نواب صاحب کی خدمت میں حاضر تھے۔ مرحوم اپنی دائمی بشاشت کے ساتھ کلام فرما رہے تھے کہ ایسے میں ایک غریب ہندو (مسلمان بھی نہیں) عورت اپنے لڑکے کو لئے ہوئے حاضر ہوئی۔ اور بہت ہی لجاجت سے کہنے لگی "میں غربت سے مر رہی ہوں۔ یہ میرا لڑکا اسی سال میٹرک پاس کر چکا ہے، اگر آپ کوشش فرمائیں تو کہیں ملازمت مل جائے گی۔ آپ کے سوا میرا اب کون ہے!!" —— مرحوم اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً ٹیلیفون اُٹھا کسی عہدہ دار سے سفارش فرما دی اور اس عورت سے کہدیا کہ "انشاء اللہ بہت جلد نوکری مل جائے گی" "تم چلی جاؤ" —— عورت ابھی دروازے کے باہر بھی نہ ہوئی تھی کہ مرحوم اشک بار ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں سسکیاں بندھ گئیں، اپنے رب کی بارگاہ میں گڑگڑا کر فریاد کرنے لگے!

"بار الہا! یہ تیرا گنہگار اور عاجز بندہ، اس سے
تیری خلق کی کیا خدمت ہو سکتی ہے، اس میں طاقت
ہی کیا ہے؟"

اور چلانا مناجات عبدیت کا سلسلہ —— یہ ہے وہ قائد جس کی تعمیر سیرت طیبہؐ کے خاکہ پر ہوئی تھی، نرے سیاسی اور معاشی لیڈروں کی سوانح ایسی مثالیں کہاں پیش کر سکتی ہیں؟ یہاں ظاہر میں قیادت تھی، شوکت تھی، عظمت تھی،

لیکن "دِل" شاہ وجود نغ کی ہیبت سے ریزہ ریزہ تھا۔

مومن کا کاشانۂ دل، غیبت، حرص، جھوٹ، بخل، اسراف اور حسد کے کوڑا کرکٹ سے پاک رہتا ہے۔ الحمدللہ کہ مرحوم ان رذائل سے محفوظ تھے، اس کے ثبوت میں پچھلے ابواب میں مختلف واقعات آچکے ہیں اور آئندہ "حسن سلوک" اور "مخالفتوں پر مسکراہٹ" وغیرہ عنوانات کے تحت بھی آئیں گے، ان کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔

مرحوم کے دِل میں کوئی شخص دولت وثروت کی بنا پر تو کیا رسوخ حاصل کرسکتا، کسی کی نری علمیت بھی ان کو مرعوب نہ کرسکتی تھی، ہاں ایک کم علم اور پُرخلوص کام کرنیوالے سے ضرور متاثر ہوتے تھے، ان کے نزدیک معیار حُسنِ عمل اور صرف بے لوث اور بے ریا عمل ہی تھا، اور اس سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ کام کرنے والوں کی جتنی ہمّت افزائیاں مرحوم کے پاس ہوتی تھیں، کہیں اور نہ ہوسکتی تھیں وہ سامنے گو زیادہ تعریف نہ کرتے تھے لیکن غیاب میں ضرور تحسین وآفرین فرماتے تھے۔ اور دعائیں دیتے تھے، راقم سوانح کے ایک دوست اکثر فرمایا کرتے ہیں کہ جب میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پہلا سوال یہی ہوتا کہ مجلس کے کتنے نئے ارکان بنائے۔ جب میں کہتا کہ تین یا چار ہی ارکان بنائے جاسکے تو فرماتے "اس سُست رفتاری سے بھی کہیں کام چل سکتا ہے خیر اور کوشش کیجئے"۔ لیکن بعد میں دوسروں سے پتہ چلا کہ مرحوم فرماتے تھے "میاں تین چار مسلمانوں میں بھی صحیح اِحساس پیدا کرنا کوئی آسان بات ہے؟ اگر ہر مسلمان اسی طرح دو تین ہی افراد کو راہ راست پر لاتے تو مجلس کا ایک بڑا کام ہو چکا" یہ تھی محبّت وقدران کے دل میں اپنے رضاکاروں کی، یہی وجہ تھی کہ اُن کے ساتھ کام کرنیوالے کبھی یہ محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ وہ کسی سخت گیر انسان کے تحت کام کر رہے ہیں بلکہ یوں سمجھتے کہ باپ بیٹے کا معاملہ ہے۔

عشقِ رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم)

ہر کہ عشق مصطفےٰ سامان اوست
بحر و بر در گوشۂ دامان اوست

بہادر یار جنگ کو عشق رسول ؐ سے وافر حصّہ ملا تھا۔ بلکہ یہی ان کی اصل پونجی تھی، مرحوم کی کوئی تقریر نہ ہوتی تھی جس میں سیرت طیبہ کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی نہ ڈالی جاتی وہ سمجھتے تھے کہ حیات کا یہی سرمایہ ہے اسے لُٹائے بغیر ملّت کی سدھار کا کام ہو نہیں سکتا چنانچہ مرحوم اس دولت گرانمایہ کو اپنے قافلہ میں خوب لُٹاتے رہے ـــــ تقریر کی روانی، فصاحت و بلاغت کب حاصل نہ تھی لیکن جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ آجاتا تو یوں معلوم ہوتا کہ بہتے ہوئے دریا میں طوفان آگیا مرحوم کا ایک ایک عضو متاثر ہوجاتا اور تقریر کی رو میں تاثیر کا دریا بھی آملتا اور جن جن خشکیوں کی طرف گزر جاتا اُن کو زرخیز و شاداب بنا دیتا تھا، جب کبھی کسی معاشی یا سیاسی تقریریں اور مفکرین کے نظریئے بیان کر چکتے اور اب سیرتِ طیبہ کا رُخ پُر نور دِکھانا ہوتا تو یوں فرماتے "یہ سب تو آپ لوگوں کی تسلّی کے لئے کہا گیا ورنہ

نہ شبنم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم"

بس اس کے بعد خود بھی اتنے متاثر ہو جاتے کہ تقریر کے بعد کافی دیر تک کسی سے بات بھی نہ فرماتے تھے۔

بہ ہر حال یہ تو تقریر کا ذکر ہوا، عمل کا جو حال تھا وہ ابتدائی ابواب میں

آچکا اور آئندہ بھی اس کی مزید وضاحت ہوگی بدعات کو توڑنا رسم و رواج کے اثر کو حتی الامکان ختم کرنا، اپنوں کے ساتھ شفقت، پرایوں کے ساتھ بے مثل سلوک، یہ سب اسی عشق رسولؐ ہی کے تو نتائج تھے؟— اور پھر یہ عشق نہیں تو کس چیز کا اثر تھا کہ جاگیر کھو کر، خطاب واپس کر کے، آرام و چین کو تج کر اکثر یہی دعا مانگتے رہے:۔

"اللّٰھم احینی مسکیناً و امتنی مسکیناً واحشرنی

فی زمرۃ المساکین"۔

یہی نہیں بلکہ عشق کی زبان بھی خوب سیکھ لی تھی، کپڑے پہنتے ہوئے گھر سے باہر نکلتے ہوئے، سواری پر سوار ہوتے ہوئے، ہر ہر موقع ہونٹ بے ساختہ ہلنے لگتے اور وہی الفاظ سُنائی دیتے جو ان موقعوں پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے، مرحوم کو ادعیہ ماثورہ بہت یاد تھیں اور ہمیشہ پڑھتے رہتے تھے، حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کا ایک ثبوت پیش کیا ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

"۶ اپریل ۱۹۴۲ء لکھنؤ

نواب یوم اقبال کی صدارت کر کے، ندوہ میں ڈالی باغ میں گنگا پرشاد میموریل ہال میں معرکہ کی تقریریں کر کے صبح کی گاڑی سے براہ دہلی حیدر آباد جا رہے تھے، میں صبح ۸ بجے ان کی قیام گاہ پر پہنچتا ہوں، خیال یہ ہے کہ یہاں سے اسٹیشن تک مفصل بات چیت رہے گی۔ موٹر اِدھر اسٹارٹ ہوتا ہے اُدھر نواب صاحب کی زبان دعاؤں پر کھُلتی ہے۔ سواری پر سوار ہونے کی دعا ہوگی، ابھی ختم ہوتی جاتی ہے لیکن یہ کیا؟ کہاں ابھی ختم ہوتی، دو سکنڈ۔ چار سکنڈ، بیس سکنڈ ایک دعاء

دو دعائیں سلسلہ ہے کہ ختم ہونے ہی نہیں پاتا۔ اور دُعائیں زیادہ تر حدیث کی ——— ! یا الٰہی یہ آل انڈیا لیڈر ہیں یا حصنِ حصین قسم کی کوئی کتاب ! شرم سے کٹا جا رہا ہوں کہ لوگ مجھے عالم، مفسر اور خدا معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں یہاں تو اُن کی آدھی دعائیں بھی یاد نہیں، یہاں انتظار کہ نواب کا خشوع وخضوع کچھ کم ہوئے تو اہل دنیا کی زبان کچھ کھلے. مگر تو بہ اس کا موقع ہی کیوں آئے دعاؤں کا سلسلہ نہ ختم ہونا تھا نہ ہوا، یہاں تک کہ اسٹیشن آگیا ایک مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو مستثنیٰ کر کے کسی لیڈر کی چاہے وہ آل انڈیا ہوں یا صوبائی، مذہبی اعمال میں مصروفیت کی ایسی مثال نہ تو اس سے قبل آنکھوں نے دیکھی ہے نہ اس کے بعد"

لیکن کیا صرف دُعائیں ورد ہی کی حد تک تھیں ؟ نہیں عمل بھی عین اس کے مطابق تھا "مسکینی" کی دعا یونہی نہیں مانگتے تھے، سب جانتے ہیں کہ عالیشان عمارتوں میں، جگمگاتے کمروں اور اپٹو ڈیٹ فرنیچر پر بیٹھے امیروں کے ساتھ اس بشاشت وبے تکلفی سے و. کبھی گفتگو نہیں فرماتے تھے جیسے غریبوں کے جھرمٹوں میں، چٹائیوں اور فرش مسجد پر بیٹھے ہنس ہنس کر اور دل کے پورے انشراح کے ساتھ فرماتے تھے، یہ امر محتاج دلیل نہیں کہ غریبوں سے مرحوم کو بڑا اُنس تھا، پھر بھی نہ جاننے والوں کے لئے ایک ثبوت پیش ہے ــــ مرحوم کے ہم محلہ ایک صاحب' تفسیر میں پابندی سے شریک ہوتے تھے، ان کے لڑکے کی شادی ہوئی تو مرحوم کو دعوت نہ دی اسی خیال سے کہ نواب صاحب کی کیا خاطر ہو سکے گی، دوسرے روز جب تفسیر ختم ہو چکی تو مرحوم نے فرمایا "عبد الرحمٰن صاحب

شادی مبارک، لیکن اپنے پڑوسی کو کیوں بھول گئے؟ — انھوں نے بڑی ہی خجلت سے فرمایا "نواب صاحب میں غریب آدمی، مجھ سے آپ کی کیا خاطر تواضع ہو سکتی تھی، آپ کو خواہ مخواہ تکلیف ہی ہوتی — بس اس قدر سُننا تھا کہ چہرہ سُرخ ہو گیا فرمانے لگے "اگر میں شریک ہوتا تو مجھے ذرا بھی تکلیف نہ ہوتی لیکن آپ کے اس جُملے نے مجھے اذیّت پہنچائی"۔ یہ تھا نوابیت اور امارت سے گریز اور غربت سے اُنس۔

عشق رسول کی ایک صفت ملت محمدیہ کے لئے بے چینی اور گریہ وزاری ہے۔ مرحوم نے اس کو بھی اپنی زندگی کا طرۂ امتیاز بنایا، سر اکبر حیدری کے دورِ وزارت میں جب حیدر آباد کی سیاست بھنور میں آچکی تھی اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک دِکھائی دے رہا تھا، وہ کِس کی آنکھ تھی جو راتوں کے سنّاٹے میں اور صبح کے سہانے میں مُسلسل اشکبار رہی؟ وہ کِس کا سر تھا جو دارالسلام کے وسیع قطعۂ اراضی کی خریدی پر سجدہ میں گِر پڑا؟ اور کس کی آنکھ تھی اور کِس کا دِل تھا جو رو رو کر مچل مچل کر بارگاہ رب العزت میں فریاد کر رہا تھا کہ پرور دگار اس زمین کو مسلمانوں کی فلاح کا ذریعہ بنا؟ مصیبت اور راحت کے موقعوں پر اس طرح رونا سُنتِ نبوی سے ہے۔ اور اسی رونے میں حقیقی ہنسی پوشیدہ ہے۔ مرحوم کے یہ الفاظ زرّین حروف میں لِکھے جانے کے قابل ہیں کہ :۔

"جب سے مسلمانوں نے راتوں کو رونا چھوڑ دیا
دِن کو ان کی ہنسی بیماروں کی سی ہنسی معلوم
ہوتی ہے۔"

سیرت طیبہ کا ایک اہم پہلو اپنوں اور پرائیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک ہے، مرحوم نے اپنی زِندگی سنوارنے میں اس پہلو پر بھی پوری توجہ ملحوظ رکھی اس کی

تفصیلات "کردار" کے باب میں "حسن سلوک" کے عنوان کے تحت آئیں گی۔

جہاں تک اپنی ذات کا تعلق تھا مرحوم نے سیرت محمدیؐ پر عمل پیرا ہونے کی امکانی کوشش فرمائی، ذاتی معاملات میں عفو، درگزر مرحوم کا نمایاں وصف تھا، یہ عشق رسول ہی کا تو نتیجہ تھا کہ روزانہ کی ڈاک میں جو گالیوں کے متعدد گمنام خطوط آتے، ان کو ایک ایک کر کے شروع سے اخیر تک پڑھتے کہ شاید کوئی کام کی بات یا بجا اعتراض نکل آئے! اور اس قسم کی تحریروں سے نہ کبھی برگشتہ خاطر ہوتے نہ مایوس ـــــ اور اگر کوئی کھلے بندوں اعتراض کرتا اور علی الاعلان ان کا عیب بتاتا تو اس کے انتہائی مشکور و ممنون ہوتے تھے، اکثر اپنی زیادہ تعریف و تحسین سے ناراض ہو جاتے بعض دفعہ تو ایسی حرکات پر لوگوں کو ڈانٹ بھی دیا کہ اگر واقعی میری وقعت تمہاری نظروں میں ہے تو اس کا عملی ثبوت پیش کرو اس لفاظی سے کیا حاصل۔

ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو چند نصیحتیں فرمائیں اور ان سے عمل کے وعدے لئے۔

قائد ملت :۔ مجلس سے کامل وابستگی کا عہد کرو۔

مجمع :۔ ہم عہد کرتے ہیں۔

قائد ملت :۔ مجلس کے احکام کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھاؤ۔

مجمع :۔ ہم وعدہ کرتے ہیں۔

قائد ملت :۔ مجلس کے خلاف جو غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں، جب موقع ملے ان کو رفع کرو، کیوں کہ زبان کے سواء اب غلط فہمیوں کے رفع کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ ہمارے لئے باقی نہیں رہا ہے۔

مجمع :- ہم وعدہ کرتے ہیں۔

قائد ملت :- جو تم سے بچھڑ گئے ہیں ان کو بُرا نہ کہو (مراد
مشائخین کی جماعت) بلکہ کوشش کرو کہ وہ
پھر مجلس سے وابستہ ہو جائیں۔

مجمع :- ان پر لعنت بھیجو۔

قائد ملت :- خبردار میں اس کو بہت بُرا سمجھتا ہوں، میں
آقائے دوجہاں کی اتباع میں دُعا کرتا ہوں
کہ اللھم اھد قومی فھم لا یعلمون:

یہ ہے حقیقی محبّت اور اُلفت کہ محبوب کی ایک ایک ادا کو اپنے لئے شمع ہدایت بنایا جا رہا ہے۔ اس کے ایک ایک اشارہ سے اپنے عمل کو سنوارا جارہا ہے۔

مرحوم کا خیال تھا اور بجا خیال کہ سیرت طیبہ پر غائر نظر ڈالے بغیر قرآن کی حقیقی فہم حاصل نہیں ہو سکتی۔ امام ابن تیمیہ بھی تو اسی کے قائل تھے اور سیرت کو یہی اہمیت دیتے تھے — مرحوم کی ہمیشہ یہ نصیحت رہی کہ بہ

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

مکمّل کِردار کا نمُونہ

"کردار ہی قسمت ہے" زبان انگریزی کی مشہور ضرب المثل، اور حقیقت کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے. ایک سفید کپڑے کو جس رنگ میں ڈالا جائے گا وہی رنگ اختیار کرے گا، یہ تو ممکن نہیں کہ سیاہی میں ڈبوئیں اور سرخ یا سبز ہو جائے. آفرنیش کے اعتبار سے ہر انسان فطرت کی پوری سادگی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ ماحول، تعلیم و تربیت جیسے موثرات اس کو مسلمان یا کافر خوش اخلاق یا بد تہذیب اور مولوی یا جنٹلمین بنا دیتے ہیں، یہ چیز حدیث سے بھی ثابت، اور مشاہدہ بھی اس کا گواہ ہے. اسی لئے ہر مذہب نے اِنسان کے اعمال و اخلاق کی دُرستی کی کوشش کی اور دین محمدیؐ کا تو یہ طرّہ امتیاز ہے کہ وہ اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کا حامل ہے. محمدؐ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعریف کن الفاظ میں ہوتی ؟ انك لعلیٰ خُلق عظیم یعنی آپؐ خلق عظیم. کے حامل ہیں. لہٰذا ہر مسلمان کو اس کے حصول کی ممکنہ کوشش ضروری ٹھیری. جس نے یہ نعمت حاصل کرلی اس کا ستارہ چمک اُٹھا اور جس نے ادھر سے بے توجہی بَرتی اس کی قسمت پھوٹی.

حُسن سلوک

مرحوم قائد ملّت نے اپنے اخلاق و کردار کے سنوارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ہمسلمان اور غیر مسلمان سَب ہی ان کے اعلیٰ کردار کے مدّاح تھے، کردار کا پہلا وصف "حسن سلوک" ہے معاشرہ میں وہی شخص سَب سے زیادہ مقبول ہوتا ہے جو

اپنے معاملات میں بہت سچا اور سیدھا ہو۔ مرحوم کو جب گھر کی سرداری ملی اور بڑے فرزند ہونے کی حیثیت سے جاگیر کی عنان ان کے ہاتھوں میں آئی تو سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے حصے محفوظ فرمائے، ان کی تعلیم و تربیت کے تمام سامان فراہم کئے اور بڑے ہونے پر ہر ایک کو اس کا حصہ دے دیا، اسی طرح دیگر اقربا کی بھی امداد فرمائی، شرعی اعتبار سے جو زکوٰۃ نکلتی تھی، ادا کرنے لگے یتامیٰ اور غربار کے حقوق پورے کئے۔ غرض اپنے اس طرزِ عمل سے گھر میں اور محتاجوں میں خوشی و مسرت کی ایک لہر دوڑا دی۔

مرحوم کے والد نے ۵ لاکھ کا جو قرض چھوڑا تھا، اس کی پائی پائی ادا کر دی، جن سے بھی مالی تعلقات رہے سب کے ساتھ نہایت دیانت دارانہ اور منصفانہ سلوک رکھا ورنہ اکثر لوگ اپنی بزرگی اور خاص حیثیت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

غریب طلبہ کے لئے وظائف دیتے تھے اور بعض غریب لڑکوں کو اپنے ہاں رکھتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا خیال فرماتے تھے طلباء کی ہمت افزائی اور دین کی طرف رغبت دلانے کے لئے تاریخ اسلام میں درجہ اول و دوم آنے والوں کو انعامات بھی عطا فرماتے تھے، اسی طرح اچھی تقریر کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی فرمایا کرتے تھے ــــــ، بعض طلباء جو حصول تعلیم کی غرض سے علیگڈھ وغیرہ جانا چاہتے ان کو قرض حسنہ بھی عنایت فرماتے تھے، اور یہ قرض کیا ہوتا دراصل دے ہی دیتے تھے، طرز یہ تھا کہ جب کوئی طالب علم اس طرح کی درخواست کرتا تو اس کے چہرہ بشرہ ہی سے تاڑ جاتے کہ واقعی اس میں تعلیم کا ذوق بھی ہے ــــ اور اس میں مرحوم کو مہارت حاصل تھی، ــ پھر کسی اور وقت اس کو طلب فرماتے

جب یہ یقین ہو جاتا کہ واقعی اس میں حصول علم کی تڑپ ہے تو سو دو سو روپیہ یہ کہہ کر دیتے کہ "عجلت نہ کرنا، جب تمہیں اللہ تعالیٰ فراخی دے تو تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کر دینا" یہ صرف انتظام اور مصلحت کے پیش نظر فرماتے ورنہ نیت واپس لینے کی نہ ہوتی تھی،

مسلمانوں کے ساتھ تو مرحوم کا جو برتاؤ رہا اس کی پچاسوں مثالیں اکثر حیدر آباد بلکہ باہر والے بھی جانتے ہی ہیں، لیکن مرحوم کا یہ احسان غیر مسلموں کے ساتھ بھی ویسا ہی تھا۔ حیدر آباد کے مشہور بیرسٹر سری کشن نے جو مرحوم کی حیات میں بھی ان کی شخصیت کے بہت زیادہ معترف تھے، تعزیتی تقریر کرتے ہوئے دارالسلام کے وسیع میدان اور کثیر اجتماع میں مرحوم کی اس صفت پر خاص روشنی ڈالی تھی، بیرسٹر صاحب کہتے تھے کہ مجلس اتحاد المسلمین کے اثر کی بڑی وجہ نواب صاحب مرحوم کی ذات اور ان کا وسیع حسن سلوک تھا، ویسے تو غیر مسلموں کے ساتھ داد و دہش کی بہت سی مثالیں پیش کی گئیں لیکن اختصار کے مدنظر یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے، بیرسٹر صاحب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ایک ہندو نے ان کے آگے اپنی داستان سنائی کہ وہ بارہ سو (۱۲۰۰) کا مقروض تھا، اور کسی طرح قرض ادا ہی نہ کر سکا، حتیٰ کہ ڈگری آئی اور قریب تھا کہ اس کی املاک کے نیلام کے ساتھ اس کی عزت کا بھی بیع ہو جاتا، چونکہ غریب آدمی تھا اس کی کوئی مدد کرنے والا اور غمگسار نہ تھا۔ یکایک خیال آیا کہ بہادر یار جنگ سے ہی معروضہ کرنا چاہیئے ورنہ پھر جو مقدر میں ہے ہو کر رہے گا۔ دوڑا ہوا پریشان مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت ہی لجاجت سے اپنی آبرو کی حفاظت چاہی، مرحوم نے اس کے چہرہ پر حقیقی پریشانی اور شرافت

کے آثار پڑھ لئے فوراً بارہ سو (۱۲۰۰) کا ایک چیک لکھدیا اور فرمایا "جاؤ قرض اَدا کر دو اور جیسے بن پڑے آہستہ آہستہ یہ رقم ادا کر دینا"۔ اس قسم کی مثالوں سے مسٹر سری کشن بیرسٹر نے یہ ثابت کیا کہ دراصل مرحوم نے ہندوؤں کے قلوب کو بھی مسخر کرلیا تھا، اور مرحوم کی شرافت وہمدردی اور بلا تفریق مذہب انسانی عظمت کی قدردانی کا اثر یہ تھا کہ سب ان کے احسان سے دبے ہوتے تھے۔

حُسن سلوک کا تعلق محض روپیہ پیسے کے لین دین ہی سے نہیں بلکہ گفتگو اور میل جول کے طور طریق بھی عین اس دائرہ کے اندر داخل ہیں۔ مرحوم کی عادت تھی کہ دوست ہو یا اجنبی اپنا ہو یا پرایا سب کے ساتھ سلام میں پہل فرماتے۔ عشقِ فاروقی رضؓ کے چند ظاہرہ اثرات میں سے یہ بھی ایک تھا کہ سلام میں تقدیم ہمیشہ اِدھر ہی سے ہوتی ——— پھر اگر ایک ہی محفل میں کتنی اصحاب موجود ہوں تو طرزِ خطاب ایسا رہتا کہ ہر ایک اپنے ہی کو زیادہ مخاطب پاتا، ہر ایک کے دِل میں گمان کیا یقین پیدا ہو جاتا کہ مجھ پر نظرِ کرم زیادہ ہے"۔ ؎

اللہ رے چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر ایک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

یہی وجہ تھی کہ جو اس بزم سے نِکلتا، سرشار اور دل میں مرحوم کی عظمت کے گہرے نقوش لئے ہوئے نکلتا پہلے تو ذاتی کشش، اندازِ گفتگو اور طرزِ تبسم ہی کیا کم تھا، اس میں اس صفت نے اور بھی تاثیر پیدا کر دی تھی، غریب سے غریب ملتا تو انہی کو اپنا مونس وغمخوار سمجھتا، عالم شاعر یا اور کوئی ماہرِ فن گفتگو کرتا تو انہی کو صحیح قدردان تصوّر کرتا، مالدار کا دِل کبھی پسیجتا اور اتفاق پر تیار ہو جاتا تو انہی کے کردار اور گفتگو کی وجہ

سے ـــــ غرض ہر ایک کے لئے اپنے اندر پوری کشش اور جاذبیت رکھتے تھے۔

حق پسندی

بعض کم فہم ہر ایک کے سامنے منھ دیکھی باتیں کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے خوش اخلاق ہیں، اخلاق کا یہ معیار اپنی کوئی بنیاد نہیں رکھتا، اخلاق کی شرط "اولیں" "حق پسندی" اور حق گوئی" کی صفت ہے، اگر کچھ دنوں یہ دورویہ روش چل بھی جائے تو بہت جلد بھانڈا پھوٹ کر رہتا ہے اور پھر ایسا انسان کسی کے نزدیک بھی قابل اعتماد نہیں رہتا۔

مرحوم پر عوام، حکومت اور ہندو سب اسی وجہ سے کامل اعتبار رکھتے تھے کہ ان کے دل و زبان میں گہری رفاقت تھی، جو دل میں ہوتا، اس کے اظہار سے کبھی نہ چوکتے تھے، بعضوں نے ان کی اس صفت کو سیاست کے خلاف کہا۔ اور ہوگی بھی سیاست حاضرہ کے خلاف، لیکن جس پر "حق" کی سیاست مسلّط تھی اس سے کیوں ایسی توقع کی جاتے ہو ـــ گلبرگہ کا واقعہ ہے کہ ایک مندر جس کا نام "دیول شرن بسپا" تھا، اس کے اور ایک قریبی مسجد کی درمیانی زمین کا جھگڑا اٹھا، مسلمان اُسے اپنی مِلک بتاتے تھے اور ہندو اُسے اپنی مقبوضہ کہتے تھے، سرکاری حکام کو بھی اس معاملہ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی، کیونکہ بہر طور جھگڑے کے اِمکانات قوی تھے، حکومت نے مرحوم سے خواہش ظاہر کی کہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیں اور تصفیہ فرمائیں۔ مرحوم گلبرگہ گئے تمام واقعات کا معائنہ فرمایا دونوں فریقوں کے بیانات سُنے، اور چونکہ ہندوؤں کا کیس زیادہ قوی پایا گیا۔ لہٰذا تصفیہ فرمایا کہ زمین انہی کو دے دی جائے، حکومت نے احکام جاری کر دیئے اور زمین ہندوؤں کو مل گئی ـــ مسلمانان گلبرگہ جو مرحوم کی سب سے زیادہ قدر کرنے

تھے جس کے خود قائد ملت بھی معترف تھے۔ برگشتہ ہو گئے کہ قائد ملت نے مسلمانوں کے خلاف فیصلہ کیوں صادر کر دیا ہے شاید انھوں نے مرحوم کو ایسا قائد سمجھ رکھا تھا جو جائز و ناجائز ہر طرح اُنھیں کو فائدہ پہنچاتا۔ جس کی سیاست کا مدار چنگیزیت پر نہیں بلکہ حقانیت پر تھا اس سے ایسی توقع رکھنا فاش غلطی تھی؛ مرحوم کو پتہ چلا کہ نوجوانان گلبرگہ خصوصاً اور عام مسلمان عموماً، مرحوم کے اس تصفیہ سے سخت ناراض ہیں تو ایک بیان شائع کروایا، جس میں اس بات پر زور دیا کہ مسلمان حق پسند اور حق شناس ہوتا ہے، عدل اس کا اعلیٰ ترین وصف ہے۔

اس بیان کا ضروری اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"مجلس کی پالیسی ہمیشہ صداقت و انصاف رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی اور مسلمان کا سب سے بڑا شیوہ یہی ہے کہ وہ ہر وقت اس آیت شریفہ کو پیش نظر رکھے۔ یاایھا الذین امنوکونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ الا تعدلواؕ اعدلوا ھو اقرب للتقویٰ و تقوا اللہ ان اللہ خبیرٌ بما تعلمون ہ

ترجمہ:۔ اے ایمان والو اللہ تعالے کے لئے پوری پابندی کرنیوالے اور انصاف کے ساتھ شہادت اَدا کرنے والے رہو اور کسی خاص لوگوں کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہو جائے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے۔

بیان کی اگلی سطریں یہ تھیں:۔

"لنگایت قوم کے لئے، مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ اُن کے

آئندہ طرزِ عمل کے لئے ایک بہترین نشانِ راہ ثابت ہوگا، اور اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کے ساتھ ان کی وفاداری میں اضافہ کا ذریعہ بنے گا۔"

(روزنامہ رہبر دکن ۲۳ر جون ۱۹۴۲ء)

آج کون ہے جو اسلامی تعلیمات کو اس شدت کے ساتھ پیش نظر رکھ کر قیادت کے منصب جلیلہ پر فائز رہے؟

یہ قومی اعتبار سے ایک مثال ہوئی۔ ذاتیات میں بھی مرحوم کی حق پسندی ایسی ہی شدید تھی، ان کے کسی فعل کو کوئی شخص غلط ثابت کر دکھاتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے، یہ نہ دیکھتے کہ کہنے والا دوست ہے یا دشمن، اپنا ہے یا پرایا، چھوٹا ہے یا بڑا، نہ اس کی پروا تھی کہ قیادت کے مقام پر فائز کردہ غلطیوں کا ایسا اعتراف مصلحت کے خلاف ہوگا، مرحوم کی اس صفت کے دوست اور دشمن یکساں مدّاح ہیں، پھر یہ اعتراف تنہائیوں میں نہیں، برملا ہزاروں کے مجمع میں ہوتا ——— اصل بات یہ تھی کہ نہ قیادت حاصل کی گئی تھی نہ خود کو قائد سمجھتے تھے، بس وہاں تو حقیقتاً فکرِ عاقبت غالب تھی، ہر کام اس وجہ سے کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں دے رکھی تھیں اُن سے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچاتے تو مواخذہ کا قوی اندیشہ تھا، اسی وجہ سے جہاں اپنی کم علمی اور کمی تجربہ کا اقرار تھا وہاں اپنی انتظامی اور قائدانہ صلاحیت سے بھی انکار نہ فرماتے تھے، اس کا اندازہ اس گرانمایہ خط ہی سے ہو چکا ہوگا جو اصل سوانح سے پہلے نقل کیا جا چکا ہے، —— ہوا یہ تھا کہ مولانا محمد علی لکچرار شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے مرحوم سے فرمایا کہ ہم بحیثیت ملازم سرکار کسی تعمیری کام میں تو حصہ نہیں لے سکتے، البتہ ایک تخریبی کام کے نے حضر

ہیں مرحوم نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمانے لگے "مذہبی نقطۂ نظر سے آپ کے انفرادی و اجتماعی اعمال پر تنقید کیا کریں گے" ـــــ اس پر مرحوم بجد خوش ہوئے، اور اسی وقت سے یہ خط وکتابت ہوتی رہی ـــــ بہر حال یاد تازہ کرنے کے لئے حسب موقع اسی خط کے چند جملے درج ذیل ہیں:۔

پہلے اجازت دیجئے کہ اپنا بے لاگ جائزہ لوں جس میں نہ انکسار ہو نہ تعلیِ شاعرانہ۔ میری قابلیت علمی چاہے علوم دینیہ والسنہ مشرقیہ سے متعلق ہو چاہے علوم حدیثیہ مغربیہ کی نسبت، بہت سطحی اور صرف بقدر ضرورت ہے۔ انکساراً نہیں حقیقتاً گنہگار ہوں اور اس روحانی طاقت اور تقویٰ کی قوّت سے بے بہرہ جو ایسے عزائم رکھنے والے کے لئے درکار ہے۔ لیکن قوم کی اجتماعی فکر کو سمجھنے اور اس سے کام لینے کی بے پناہ صلاحیت قدرت نے مجھے عطا فرمائی ہے، اور صرف یہی صلاحیت میری اس وقت کی کامیابی کا راز ہے"۔

تصنع سے کیسا گریز اور حق پسندی کی کتنی اعلیٰ مثال ہے، ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انکسار کے جامہ میں بھی غرور ہی کا پیکر چھپا رہتا ہے۔

مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے:۔

"پچاسوں در کی جبہ سائی چھوڑ کر انسان صرف ایک بارگاہ کی ناصیہ فرسائی کرنے لگ جائے تو ساری کائنات اس کی ہو جائے گی، پچاسوں کو خوش کرنے کی کوشش، ایک کو بھی راضی نہ کرا سکے گی"۔

توحید اور وحدانیت کا یہ درس قولاً نہیں فعلاً دیا گیا، مرحوم شاید

ہی کوئی بات ایسی کہتے تھے جس پر عمل نہ فرماتے تھے، ویسے تو ان کی زندگی کے بیسیوں واقعات اور بہ حیثیت مجموعی کل زندگی موحدانہ عمل سے بھری پڑی ہے لیکن یہاں بھی موقع کے اعتبار سے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دفعہ "درس اقبال" ختم ہو چکا تھا، نماز مغرب کا وقت بھی آپہنچا، مرحوم اور دوسرے سامعین نماز کے لئے صحن کی طرف بڑھنے لگے، گرمی کی وجہ سے "بیت الامت" کے صحن ہی میں نماز کا انتظام تھا ایسے میں معلمین "درس اقبال" میں سے ایک صاحب جن کو نواب صاحب بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور محبت بھی فرماتے تھے اپنے گھر کا رُخ کرنے لگے، نواب صاحب کی حمیت ایمانی جوش میں آگئی چہرہ سُرخ ہو گیا کڑک کر کہا۔

"جناب نماز کا وقت ہو چکا اور آپ کدھر جا رہے ہیں؟ اگر آئندہ سے نماز پڑھنے کا ارادہ نہیں تو میرے گھر میں قدم رکھنے کی ضرورت بھی نہیں، آپ کی ہماری دوستی کس کے لئے ہے"؟

لوگ حیران تھے کہ نواب صاحب کس کو ڈانٹ رہے ہیں، ایک آل انڈیا بلکہ آل ورلڈ (عالمی) شہرت رکھنے والی ہستی کو؟ اس کو جس سے ابھی کہہ رہے تھے کہ آپ ہی درس دیجئے میں تو اساتذہ میں سے نہیں، طالب علموں میں سے ہوں! اللہ رے حق پسندی کہ دین کے مقابلہ میں نہ دوستی کی پرواہ نہ کشیدگی کا رنج۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے (جوہر)

اس قسم کا ٹکراؤ افراد سے نہیں جتھوں سے بھی ہوا، مشائخین دکن بعض فروعی اختلاف کی بناء پر مجلس سے الگ ہو چکے تھے۔ انھوں نے ڈو

پارٹیاں بنائیں (کیونکہ خود آپس میں بھی پھوٹ پڑ گئی تھی)، ایک "مجلس علمائے دکن" کہلائی دوسری "مجلس مشائخین دکن رجسٹرڈ" کے نام سے موسوم کی گئی، مشائخین دکن رجسٹرڈ کی طرف سے ایک جلسۂ عام کیا گیا اور اس میں قائد ملت کو بھی دعوتِ تقریر دی گئی، مرحوم نے قبول کر لی، اخبار میں جیسے ہی اس جلسے کا اعلان شائع ہوا مختلف لوگ آ آکر مرحوم سے پوچھنے لگے کہ "آپ ان کے جلسہ میں تقریر کیوں فرما رہے ہیں، ان سے مجلس اتحاد المسلمین کو کافی نقصان پہنچا اور باوجود آپ کی مسلسل کوشش کے انھوں نے اپنی روش نہیں بدلی!" — مرحوم نے ہر ایک سے مسکراتے ہوئے یہی فرمایا "ہاں میں نے سب کچھ جانتے ہوئے یہ دعوت قبول کی ہے"۔ جلسہ کی تاریخ آئی ہزاروں مسلمان زمرد محل ٹاکیز کے وسیع ہال میں جمع ہو گئے، جلسہ شروع ہوا، قائد ملت کی باری آئی، سبھوں کی نظروں سے تعجب اور غور کے آثار نمایاں تھے کہ دیکھیں کیا فرماتے ہیں — محمد بہادر خاں جو غیاب میں کسی کے متعلق "ا" لفظ بھی نہ فرماتے تھے، ہزاروں کے مجمع میں حق گوئی پر تل گئے اپنی کم علمی کا اقرار کیا لیکن اُن کے طرزِ عمل کی بھی دھجیاں بکھیر دیں اعلان کیا کہ "میرا مقام قیادت کا نہیں، کوئی بڑھ کے اس مقام کو حاصل کیوں نہیں کر لیتا؟ یہ مقام میں نے لیا نہیں بلکہ عام مسلمانوں نے عطا کیا ہے!" غرض گھنٹہ بھر اسی قسم کی تقریر فرمائی، عام مسلمان مطمئن ہو گئے، بانیان جلسہ میں سے حق پسندوں کے دِل کو بات لگی، اب یہ سوال یہاں اُٹھانا بیکار ہے کہ یہ احساس کتنوں میں عملی شکل اختیار کر گیا!

اسی طرح یوم "سیزدہ صد سالہ یادگار امام حسین رضؓ" کے اجلاس ہوئے سُنی اور شیعہ کے مشترکہ جلسے تھے، تین روز تک ہوتے رہے اور بڑے

ہی شاندار پیمانہ پر ہوئے، تیسرے روز کا جلسہ قائد ملت کی صدارت میں تھا مجمع گذشتہ دو دنوں سے کہیں زیادہ تھا، قائد ملت نے اپنا پُرمغز خطبہ صدارت سُنایا (جو اسی سال اخبار "رہبر دکن" اور "صدق" کے صفحات میں شائع بھی ہوا)، اس کے بعد دوسری تقریریں شروع ہوئیں، لوگ ایک ایک کر کے کھسکنے لگے، شہید یار جنگ صدر استقبالیہ تھے، فرمانے لگے "نواب صاحب آپ کی تقریر ہو چکی اَب لوگ کیوں ٹھیریں گے! بہتر ہوتا آپ اخیر میں تقریر فرماتے" مرحوم نے اعلان کیا کہ وہ اخیر میں بھی تقریر فرمائیں گے، اُٹھتے ہوئے بیٹھ گئے اور جاتے ہوئے لوگ لوٹ آئے، جب سب تقریریں ختم ہو چکیں تو شیر دِل قائد نے اُٹھ کر مسلمانوں کے فرقہ وارانہ افتراق کی پول کھولنی شروع کی، پہلے سُنیوں کو ڈانٹا پھر شیعوں کو لتھاڑنا شروع کیا "علیؓ کی محبت کا دعویٰ کرنے والو اُن جیسا عمل بھی کر دِکھاؤ" اور اَب تاریخ کے حوالے شروع ہوئے کہ حضرت عثمانؓ کے پہرے کے لئے حضرت علیؓ نے کن ہستیوں کو مقرر کیا تھا؟ یہ کس نے کہا تھا کہ "عمرؓ! تم نے اپنے بعد اور کسی کو ایسا نہ چھوڑا کہ اس جیسا عمل کر کے خدا تعالیٰ سے ملنا مجھے پسند آتا" وغیرہ تین روز سے مُسلسل تقریریں ہوتی رہیں کسی کی زبان ان حقائق پر کھُل نہ سکی تھی. آخر اسی مردِ مجاہد "سیف الاسلام" نے حق گوئی اور حق پسندی کا ثبوت دیا، دِل میں تو نہ جانے کتنوں کے یہی خیالات ہوں گے. لیکن جرأت اظہار قلندر رہی کا حِصّہ ہے۔

ہزار خوف ہو لیکن زبان ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

جوان مردی

ایک مجاہد زندگی کا سب سے نمایاں پہلو "جوانمردی" ہے جوان مرد کو چونکہ صرف ایک ہی موت کا یقین ہوتا ہے، اس لئے وہ سر بکف میدانِ جہاد میں اُتر آتا ہے، محمد بہادر خاںؒ ایک مجاہد نسب سے تعلق رکھتے تھے، ایک روح پرور دین کے حامل تھے. جوانمردی کی اعلیٰ مثالیں یہاں نہیں تو اور کہاں ملیں گی۔

حیدرآباد کے ہندو مسلم فسادات کے زمانے میں، جوشِ انتقام سے بپھرے مجمع میں کون بے تحاشہ گھس جاتا تھا؟ کس کی قوت ان سب کی طاقتوں پر غالب آجاتی تھی؟ اپنوں کے مجمع کو چھوڑیے پرائیوں اور دشمنوں کے مجمع میں یکا و تنہا گھس جانا اور ان کو ڈرانا، بھگانا مرحوم کے لئے کب کوئی مشکل بات تھی مخلصین واحباب روکتے تھے کہ مرہٹوں کے محلہ میں، ان کے گلی کوچوں میں گذرنا خلاف مصلحت ہے اور اس میں جان کا خدشہ ہے لیکن جس نے اپنی جان کو جان جاناں کے تفویض کر دیا ہو وہ ان کی باتوں سے کیسے رُک جائے اور دراصل یہی جرأت وہمت تھی جس سے دشمن خائف ولرزاں رہتے تھے. میدان جنگ میں آلاتِ حرب سے زیادہ جرأت و ہمت ہی شکست وفتح کی ضامن ہوتی ہے۔

حیدرآباد میں خیر جو کچھ ہوا اس کو طوالت کے بدنظر چھوڑے دیتے ہیں کیونکہ بہر حال ایک "شیر دل" اور "رستم دست" کا مقابلہ پہاڑی چوہوں سے تھا، لیکن آیئے ایک منظر اس مقام کا دکھائیں جہاں کے لوگوں کی جرأت سے "صاحب بہادر" بھی (باوجود اپنی حربی طاقت کے) گھبرا جاتے ہیں سرحد میں سردار اورنگ زیب خاں عنانِ وزارت سنبھالے ہوئے ہیں، اراکین کے انتخابات درپیش ہیں، اسی زمانے میں قائد اعظم پر ایک

بدنیت نے قاتلانہ حملہ کیا، سردار صاحب نے مزاج پرسی کی تو قائداعظم نے جواب دیا کہ۔

"میرے زخم اسی وقت مندمل ہوں گے جبکہ چاروں انتخابات مسلم لیگ جیت لے۔"

قائداعظم کی تمنا کو پورا کرنا ہے، ایک پاکستانی وفد بنایا جاتا ہے جس کے اراکین خود سردار اورنگ زیب خاں، قاضی محمد عیسیٰ (صدر بلوچستان مسلم لیگ) اور مرحوم بہادر یار جنگ قرار پاتے ہیں، اس طرح یہ مہم شروع ہوتی ہے — سرحد میں فقیر ایپی کی ہولناک سرگرمیاں پوری دہشت انگیزی سے جاری ہیں، سرحد کی سڑک پر سفر کرنا گویا موت کے راستہ پر چلنا ہے، مگر حصول مقصد کی خاطر پاکستانی وفد کی موٹر اسی راہ سے برابر گذر رہی ہے قاضی عیسیٰ موٹر چلا رہے ہیں اور فقیر ایپی کے حملے کے اصول کے تحت، قاضی عیسیٰ ناوکِ اجل کے پہلے شکار ہیں، قائد ملت ان کے ہاتھ سے اسٹیرنگ لے لیتے ہیں۔ عجیب کشمکش کا عالم ہے کہ قاضی صاحب قائد ملت کی جان کو زیادہ گراں قدر سمجھتے ہیں اور قائد ملت فرماتے ہیں: "پہلے میں —"

غرض اس طرح بڑھے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک شخص نے موٹر روکی اور قریب آکر پوچھا — "آپ میں سے بہادر یار جنگ کون ہے؟" قائد ملت نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے تنہائی میں گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی، قاضی عیسیٰ اور سردار اورنگ زیب خاں منع کرتے ہی رہ گئے اور شیر دل مجاہد اس کے ساتھ تنہا چل پڑا، اس شخص نے تنہائی میں لے جا کر فقیر ایپی کا حسب ذیل پیام سنایا۔

"فقیر صاحب نے آپ کو سلام کہا ہے اور یہ پیام بھیجا

ہے کہ ہمیں آپ کی تشریف آوری کی اطلاع تھی اس لئے آپ کے سفر کے انتظامات کر دیئے گئے ہیں. آپ جہاں جہاں سفر کرنا چاہیں ہمیں اطلاع دیجئے تاکہ وہاں بھی حفاظتی انتظامات کر دیئے جائیں"

سرفروشانہ جرأت کا مظاہرہ دیکھ لیا — جو سر اُڑانے آئے تھے وہ سر جھکائے چلے جانے پر مجبور ہو گئے، پاکستانی فوج میں ایسے "رستم دست" سپاہی کتنے ہیں. آہ رومیؒ کی آرزو۔ ع

شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

اس دور میں کیسے پوری ہوئی اور ختم بھی ہوگئی۔

بذلہ سنجی

مرحوم قائدِ ملت زاہد تھے مگر خشک نہیں بلکہ تر اور شگفتہ مرحوم نے بڑا ہی لطیف مزاج پایا تھا ان کی محفل میں بیٹھنے والے جانتے ہیں کہ ظرافت کی ایسی اعلیٰ شراب کسی اور میکدہ میں پلائی نہ جاتی تھی اور بذلہ سنجی کے ایسے لبریز سبو کسی اور محفل میں لنڈھائے نہ جاتے تھے، — خوش خلقی مرحوم کا خاص وصف تھا، لیکن جس طرح مرحوم کا علمی مذاق بہت اعلیٰ اور ان کی زندگی عام لوگوں سے زیادہ ارفع تھی، ان کی بذلہ سنجیاں بھی ایک خاص معیار رکھتی تھیں. ان سے پورے طور پر وہی محظوظ ہو سکتے ہیں جو مذاق کا ایسا ہی اعلیٰ معیار رکھتے ہوں. بہت کم ایسا ہوتا بلکہ ہم نے تو سُنا ہی نہیں کہ ان کی مذاحیہ گفتگو میں کوئی کام کی بات نہ ہوتی ہو. ہر مزاح میں ایک آدھ حقیقت کی طرف اشارہ اور ایک آدھ بُرائی پر لطیف طنز ضرور ہوتا تھا۔

بلادِ اسلامیہ کی سیر کے سلسلہ میں ساحل اٹلی سے گذر رہے تھے.

مرحوم کے ایک ایٹالین (اٹلی کا باشندہ) دوست بھی ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یہ جہاز کی دوستی تھی ــــــ انھوں نے دیکھا کہ شام ہوتی ہے تو یہ شخص زقائد ملت، صرف شیروانی اُتارتا ہے اور سو جاتا ہے، صبح اُٹھتا ہے تو پھر انہی کپڑوں پر شیروانی پہن لیتا ہے، رہا نہ گیا، کہنے لگے ہندوستانی واقعی بہت پیچھے ہیں، ان کو لباس کا استعمال تک معلوم نہیں اور نہ ان کا لباس اچھا ہے" مرحوم نے مسکراتے ہوئے پوچھا" اچھا تم ہی بتاؤ کہ اچھے لباس کے لئے کیا شرائط ضروری ہیں"؟ اس پر وہ صاحب سٹپٹاتے اور کہنے لگے "جی آپ ہی فرمائیں" ــــــ مرحوم فرمانے لگے :-

دیکھو بھئی لباس ایسا ہو۔

(ا) جس سے موسمی اثرات سے محفوظ رہ سکیں

(اا) اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے میں سہولت رہے اور

(ااا) ساتھ ہی بھدا نہ ہو اور خوش وضع ہو ــــــ اس لحاظ سے دیکھو تو میری شیروانی جو گلے سے گھٹنوں کے نیچے تک ہے، موسمی اثرات سے پورا تحفظ کرتی ہے، میرا پاجامہ میرے کسی طرح بھی اُٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے میں مزاحم نہیں ہوتا، اور میرا لباس بہ حیثیت مجموعی خوش وضع بھی ہے البتہ ــــــ اس میں ایک نقص ہے، جو تمہارے لباس میں نہیں پایا جاتا وہ یہ کہ اس سے انسانی جسم کی فطری تراش ظاہر نہیں ہوتی"! اس طنز لطیف پر ایٹالین صاحب اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔

طنز آمیز مزاح کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو ــــــ حیدرآباد کے ہندو، مسلم نمائندوں کی ایک کمیٹی ہو رہی ہے، مسائل سیاسی زیرِ بحث ہیں، تحفظ حقوق کا مسئلہ پیش ہے، مسلمانوں کی نمائندگی قائد ملت فرما رہے ہیں، اور ہندوؤں کی ترجمانی مسٹر نرسنگ راؤ (مدیر رعیت) مسٹر نرسنگ راؤ نے کہا

.....'' نواب صاحب ہم نے تو کافی ایثار سے کام لیا ہے برطانوی ہند میں گاندھی جی نے مسلمانوں کے اتنے حقوق بھی تسلیم نہیں کئے ہیں'' — قائدِ ملّت نے مسکراتے ہوتے جواب دیا:۔

''راجہ جی گاندھی تو آخر بنیا ٹھیرا، اور آپ تو پٹیل ہیں، آپ کو فراخ دلی کا ثبوت دینا چاہیئے''۔

ایک لطیفہ ایران کا بھی ہے۔ مرحوم کو کسی مقام تک جانا تھا فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے کرایہ کی موٹر لینی پڑی۔ موٹر ڈرائیور سے پوچھا فلاں مقام تک پہنچانے کے لئے کیا لوگے؟ اس نے، جیسا کہ ان لوگوں کا بالعموم طرز ہوتا ہے، پوچھا ''آپ کتنے ہیں؟'' مرحوم کو مذاق سوجھا، فرمایا ''ہم دو ہیں'' اس نے جواب دیا کہ ''فی کس اتنا کرایہ ہوگا، مرحوم فرمانے لگے ''کرایہ تو ایک ہی شخص کا دوں گا لیکن ہم چلیں گے دونوں'' — اس نے اِنکار کیا کہ ''میں تو نہ لے جاؤں گا'' مرحوم نے فرمایا ''میں تو ضرور جاؤں گا اور صرف اپنا ہی کرایہ دوں گا، ساتھی کا ایک حبّہ بھی نہ دوں گا — یہی اِنکار و اصرار چلتا رہا جب مرحوم نے دیکھا کہ اب وہ غصّہ میں آچکا ہے تو ہنسکر فرمانے لگے:۔

''میاں! میں اور میرا اللہ ہم دو ہیں، کیا دونوں کا کرایہ لوگے؟ میرے ساتھ کون شخص تھا جو تم نے پوچھا کہ آپ کتنے ہیں؟'' — اس پر وہ شرمندہ ہوگیا اور اس قدر عزت و محبّت سے بٹھالیا کہ جیسے مرید ہی ہوگیا ہے۔

مدراس کا واقعہ ہے، جواہرلال نہرو اور مرحوم میں کچھ گفتگو ہو رہی تھی پنڈت نہرو نے مذہب اسلام کی تعلیمات کو محدود بتانے کی لاحاصل کوشش کی، مرحوم فرمانے لگے — '' پنڈت جی! واقعی ہمارا مذہب بڑا محدود

ناک سے ٹپکا ہوا ایک برہمن!" — پنڈت نہرو نے تعجب سے پوچھا "نواب صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ فرمانے لگے "مطلب صاف ہے تمہارا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد روح دوسرا جنم لیتی ہے، اچھے اعمال ہوں تو گائے اور بُرے ہوں تو کتّے بلّی، وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے تو مجھے کیا معلوم، ممکن ہے یہ کائیں کائیں کرتا ہوا کوّا کوئی تمہارا آرٹیر (مفرر) ہوگا، اسی طرح سارے حشرات الارض اور چرند پرند تمہارے ہی عزیز اقربا ہوں گے — رہی دوسری بات، تو وہ واضح ہے، عبادت، قیادت اور بزرگی برہمن کے سوا اور کسے نصیب ہوسکتی ہے۔"

یہ تھے بذلہ سنجی کے چند اعلیٰ نمونے، اسی طرح مرحوم کی ہر مزاح میں کوئی نہ کوئی علمی بات ضرور ہوتی تھی، یہاں عامیانہ مذاق تو کبھی کسی نے دیکھا ہی نہیں۔

تواضع

محمد بہادر خاں پیکر تواضع تھے بچپن سے اخیر عمر تک مرحوم کی اس صفت کے سب ہی مدّاح رہے — چھوٹا ہو یا بڑا شناسائی ہو یا اجنبی "سلام" کرنے میں پہل ہمیشہ ان ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔ اہل علم اور اور اہل تقویٰ کے آگے تو اس تواضع سے پیش آتے جیسے کوئی شاگرد اپنے عزیز اُستاد کے آگے بچھ جاتا ہے — حضرت علّامہ سیّد سلیمان ندوی سے پہلی ملاقات کا حال خود مولانا مدظلہ، ہی کی زبانی سنیے:۔

"اتفاق دیکھیے کہ چند ہی روز بعد مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی صدر اعظم دولت آصفیہ کے یہاں دعوت ہوئی (تیرہ برس قبل کا واقعہ ہے) بہت سے مہمان تھے، کھانے سے فرصت ہوئی تو ایک خوبصورت سڈول نوجوان شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس، بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھا، اور ادب سے ہاتھ ملا کر گویا ہوا میں خود اپنا تعارف کراتا ہوں، میں ہوں آپ کا شاگرد

بہادر خاں! آنکھوں نے حیرت سے صورت دیکھی، نا آشنا پایا تفصیل پوچھی، فرمایا آپ کی کتابوں کو پڑھ کر علم پایا اور خطبات مدراس کورٹ کو میلاد کی محفلوں کو گرمایا، ان کی اس تواضع سے دِل شرمندہ ہوا اور ان کی اس شرافت سے سننے والوں کی گردن جُھک گئی"۔ (معارف اگست ۱۹۴۴ء)

حق پسندی اور تواضع میں بہت ہی کم فاصلہ ہے، جس کا شعار حق پسندی، حق جوئی اور حق شناسی ہو جائے، تو انکسار، احسان مندی وفا کیشی خود بخود اس میں پیدا ہو جاتی ہے، اور جب یہ صفات کسی ہستی میں جلوہ فرما ہو جائیں تو اعترافِ حقیقت اور اظہارِ حقیقت، خواہ تخلیہ میں ہو یا علانیہ، کوئی شرمندگی اور کسی بے جا ندامت کا باعث نہیں ہو سکتا، مرحوم جس کسی کا ذرا سا بھی اِحسان رکھتے تھے، اس کا اظہار خانگی صحبتوں اور پلیٹ فارم پر یکساں خلوص سے فرماتے تھے۔ اس کا ثبوت مولانائے موصوف ہی سے حاصل کیجیے:۔

"ان کی یہ تواضع اور خاکساری تنہائیوں ہی میں نہیں ہزاروں کے مجمع میں اسی طرح ظاہر ہوتی تھی، مولانا گیلانی، (مناظر احسن گیلانی مدفیوضہ) کے ساتھ ان کی ممنونیت برملا ان کی زبان سے ظاہر ہوتی، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، کی حوصلہ افزائیوں کا اعتراف علی گڑھ یونین کی پہلی تقریر میں خود میرے کانوں نے سُنا۔ دار المصنفین کی کتابوں کے احسان کی کہانی اسی سال مارچ میں "دار السلام" حیدر آباد کے عظیم الشان جلسہ میں سب نے سُنی"۔ (معارف ایضاً)

یہی نہیں بلکہ اگر کبھی محسوس کرتے کہ لوگ مقابلتاً کسی اور صاحبِ علم وفضل کو اُن پر ترجیح دے رہے ہیں تو بگڑ جاتے، ڈانٹ دیتے اور اپنی فروتنی کا اظہار پوری دیانت اور فراخ دلی سے فرماتے، اس قسم کا ایک موقع علی گڈھ یونین میں پیش آیا تھا جہاں مرحوم کی تقریر کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی بھی تقریر تھی —— اس کی تفصیل خود مولانا ہی کے قلم نے لکھی ہے :۔

"۲۶ اکتوبر ۱۹۴۱ء مقام علی گڈھ، یونیورسٹی کی مجلس تاریخ و تمدن اسلامی کی دعوت پر میرا اور نواب صاحب کا دونوں کا بیان ہونے والا تھا، نواب سحر بیان کی خطابت بچے بچے سے تحسین حاصل کئے ہوئے، اہل جلسہ نے غلطی کر کے مجھ جیسے کج مج زبان کا وقت اس بلبل ہزار داستان کے ساتھ رکھ دیا۔ وسیع اور لق ودق اسٹریچی ہال اوپر سے نیچے تک بھرا ہوا، سامنے جو لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا، اس نے جواب دے دیا، اب بھلا میری آواز کیا پہنچتی، ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہدیا کہ ہمارا وقت خواہ مخواہ ضائع ہو رہا ہے، کچھ سنائی نہیں دیتا، اور ہم تو نواب صاحب کے مشتاق ہو کر آئے ہیں۔ میں تو پہلے ہی سے ہٹنے پر آمادہ تھا۔ ذرا صدر صاحب سے معذرت کر کے ڈائس سے اترنے لگا، معاً نواب صاحب کھڑے ہوئے اور گرج کر بولے "کوئی سنے یا نہ سنے کوئی بیٹھے یا چلا جائے میں خود مولانا کے بیان کو اخیر تک سنوں گا، میں تو انہی کا لکچر سننے آیا ہوں، اور جب تک وہ اپنا لکچر ختم نہ کریں

گے میں ہرگز ایک لفظ بولنا نہ شروع کروں گا"۔ مجمع میں سناٹا چھا گیا! ——— ہے کہیں اس دور میں شرافت کی ایسی مثال؟" (صدق)

تواضع کی یہ مثالیں واقعی علماء اور حقیقی مشائخین ہی کی حد تک نہ تھیں بلکہ وہ ہر چھوٹے بڑے سے جھک کر ہی ملا کرتے تھے۔ البتہ یہ تواضع کبھی بیجا مروت کی حد تک نہ پہنچ سکی، جب کبھی حق و باطل میں ٹکراؤ ہوتا تو چاہے کتنی ہی بڑی اور کیسی ہی مقدس ہستی کیوں نہ ہوتی اگر اسے باطل کی تائید میں پاتے تو سب سے پہلے حق کی حمایت میں خود ہی اس کے مقابل کھڑے ہو جاتے تھے! — "حق پسندی" کے باب میں لکھا جا چکا کہ کس طرح مشائخین دکن کے بھرے اجلاس میں ان کا ایک ایک عیب گنا دیا تھا، مرحوم ان میں سے ہر ایک کی قدر کرتے تھے اور اسی بناء پر انھیں دوبارہ مجلس اتحاد المسلمین میں لانے کی مرتے دم تک کوشش فرماتے رہے لیکن جب دیکھا کہ انھوں نے ڈیڑھ اینٹ کی الگ ہی مسجد بنالی ہے تو صاف صاف سُنا دیا کہ

"جب تک مشائخین دکن کے عمل سے مجلس کے راستہ میں مزاحمت نہ ہو، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اگر ان کی جماعت کا کوئی قدم مجلس اتحاد المسلمین کے خلاف اُٹھا تو یاد رکھیں کہ سب سے پہلا شخص جو ان کی مخالفت کے لئے کھڑا ہوگا، وہ بہادر خاں ہوگا"۔

یہ ہے تواضع کی صحیح کیفیت، بعض کم فہم ہر بات میں ہاں میں ہاں ملانے کو تواضع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ تواضع نہیں بُزدلی ہے اور یہ بہادروں کا کام نہیں۔

بے مِثل خِطابت

فن خطابت ان فنوں میں سے ہے جن کا تعلق "حصول" سے زیادہ "عطا" پر اور کسب" سے زیادہ "وہب" پر ہے۔ اس فن میں نمایاں حیثیت حاصل کرنا باوجود سعئ بلیغ کے انتہائی مشکل اور بعض صور توں میں محال ہے ۔ اِنسان کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ وہ اور حیوانات کی بہ نسبت "نطق" کی دولت سے بے حد وحساب مالامال ہے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اُٹھتے ہوئے خیالات اور احساسات کو نطق کے سانچے میں ڈھالنا اسی کا حق ہے، لیکن اس حیثیت میں سب مساوی نہیں، کوئی اپنے احساسات کو اس طرح پیش کرسکتا ہے کہ ان کا ایک دُھندلا سا خاکہ سُننے والوں کے آگے آجاتا ہے، اور یہ درجہ تقریباً ہرانسان کو حاصل ہے لیکن بعض لوگ اپنے اظہارِ خیال پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ اپنے اندرون کو من وعن پیش کر دیتے ہیں، اور اس درجہ کا حصول کچھ زیادہ مشکل نہیں، مگر چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنے دِل کی بات کو پوری صفائی کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں بلکہ اثر بھی منتقل کرتے ہیں اور شائد جتنے خود متاثر ہوتے ہیں اس سے زیادہ اوروں کو متاثر کر سکتے ہیں، یہی مقام سحر کاری کا ہے اور اس کے لئے حصول کے ساتھ ساتھ عطیہ قدرت بھی انتہائی ضروری ہے، ایسے ہی

مقررین کے "بیان" سے متعلق فرمایا گیا "ان من البیان سحرا"

فن تقریر کی باریکیاں جاننے والوں اور فلسفۂ اجتماع کی گتھی سلجھانے والوں نے "خطیب کے آلات" کی کافی وضاحت کی ہے، سب سے پہلی چیز جو ایک اعلیٰ درجہ کے خطیب (آورٹیر) میں ضروری ہے، وہ ہے اس کی "سطوتِ ذاتی" یعنی اس کا پُرشکوہ اور باعظمت ڈیل ڈول پھر اسی مناسبت سے "بلند آواز" ورنہ اگر انسان ہو تو بڑا ہی وجیہہ اور آواز ہو بہت پست اور بیمار کی سی تو اس کی تقریر کا خاک بھی اثر نہ ہوگا، ان دو صفات کے ساتھ "موثر لہجہ" بھی انتہائی ضروری ہے کیونکہ اگر لہجہ نہایت رکیک قسم کا ہو تو اُلٹا ہی اثر پڑے گا ــــ ان تینوں خوبیوں کا حامل اگر نطق کے ذریعہ ساحری کرنا چاہے تو اسے تین باتوں پر قدرت حاصل ہونی چاہیئے جو مشق سے ہاتھ آتی ہے۔ اسے اپنی ہر بات کو بڑے "ادعا" اور انتہائی "تحکم" کے ساتھ پیش کرنے پر قابو حاصل ہو، اسی کو اصطلاح میں "تاکید" کہتے ہیں، ساتھ ہی اپنا مفہوم ذہن نشین کرانے اور اپنی بات منوانے کے لئے ایک ہی چیز کو مختلف انداز میں نئے نئے اور دلکش پیرایہ میں بیان کر سکے، اسی کو "تکرار" کہتے ہیں، نیز اس میں ایک اور خوبی بھی ہونی چاہیئے وہ یہ کہ جس بات سے ایک فرد متاثر ہو چکا ہو، اسی اثر کو وہ عام کر سکے، تاکہ اُس ایک کی طرح سارا مجمع مُتاثر ہو جائے، یہی "تعدیۂ اثر" کہلاتا ہے ــــ پہلی تین خصوصیات سے جو جتنا سرفراز کیا گیا ہوگا اور بعد کی تین خوبیاں جس حد تک پیدا کر لی گئی ہوں گی، اتنا ہی وہ شخص بہترین اور موثر ترین خطیب ہوگا!

لیکن یہ تو "مشین گن" کی ساخت ہوئی محض مشین بنا لینے سے تو دشمن مغلوب نہ ہوگا اس مشین کے لئے "گولیاں" فراہم کرنا بھی ضروری

ہے، خطیب کے "مشین گن" کی گولیاں، اس کے معلومات کا ذخیرہ ہے جو بَر وقت ترشے ترشائے انداز میں —— مراد فصاحت، بلاغت اور بدائع کی خوبیوں کے ساتھ —— اس مشین سے نکلنے لگے، اب جو بھی گولی نکلے گی وہ مخاطب کے قلب و دماغ کو مجروح کر کے رہے گی۔

مرحوم قائد ملت کو خدائے تعالےٰ نے سطوت ذاتی کے اعلیٰ ترین معیار کا نمونہ بنایا تھا، جسیم و شکیل تھے متناسب الاعضاء تھے آواز بھی ویسی ہی بلند، اور موثر کہ ہزاروں کے مجمع کو بلا لاؤڈ اسپیکر (آلہ مکبر الصوت)، نہایت آسانی سے مخاطب کر سکتے تھے، اس کے ساتھ لہجہ بھی ایسا دلفریب پایا تھا۔ کہ مخالفین کے مجمع میں بھی بولنے لگتے تو سب کی گردنیں جُھک جاتیں، زبانوں کو قفل لگ جاتے، دِلوں کے پٹ کھلنے لگتے اور بات اپنا قبضہ جما کر ہی رہتی۔

اس عطا سے فائدہ اٹھانے کے لئے مرحوم نے تقریر کی کافی مشق بھی کی، اور بہت جلد ایسا قابو حاصل کر لیا کہ "تاکید"، "تکرار" اور "تعدیہ اثر" کے ذرائع پوری طرح ان کے قابو میں آ گئے —— مرحوم کے وسیع مطالعہ اور زبان پر تحکم نے ان تمام خوبیوں سے مِل کر تقریر کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا تھا جس پر ہندوستان کا کوئی مقرر نہ اُتر سکتا تھا۔ بعض لوگ بولنے میں تو بڑے ماہر ہیں انہیں زبان کی ساری خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں لہجہ بھی کافی موثر ہے لیکن "حرکات" (یعنی چشم و آبرو، ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارے) کے حسن سے جو اثر میں بھی تاثیر پیدا کرتے ہیں اکثر یا تو عاری ہیں یا بہت کم بہرہ ور ہیں، مرحوم اس معیار کے مقرر تھے کہ ان کو دیکھ کر فن تقریر کی ایک اعلیٰ معیاری کتاب لکھی جا سکتی تھی۔

لیکن کیا واقعی محض یہی چیزیں تھیں جن کی بنا پر چند ہی سالوں میں مرحوم کی سحر کلامی اور فصاحت بیانی کا سکہ ہندوستان کے طول و عرض میں بیٹھ گیا، اصل یہ ہے کہ جتنی "صفاتِ مقرر" گنائی گئیں ان سب کا تعلق ظاہر سے ہے اور ظاہر ہے کہ ظاہر کا اثر بھی ظاہر ہی پر پڑتا ہے. بہادر یار جنگ کی ساحری کا راز "اندرون" تھا ان کی تڑپتی ہوئی روح تھی، مچلتا ہوا دِل تھا، عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ تھی. اور سرد دلوں میں حرارت ایمانی پیدا کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا. فن تقریر کے تمام داؤ پیچ ایک طرف اور "جذب اندرون" کی سادگی دوسری طرف، جس اکھاڑے میں بھی ان کی مڈبھیڑ ہو گی "جذب اندرون" ہی کے سر نصرت و کامرانی کا سہرا بندھے گا۔

میلاد کی محفلیں

مرحوم کی تقریروں کی ابتدا میلاد کی باسعادت محفلوں سے ہوتی ہے۔ ۱۹۴۶ء سے تقریباً بیس سال قبل کا وہ زمانہ تھا جب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدر الصدور دولت آصفیہ تھے اور ان کے سبب سے میلاد کی محفلوں کی بڑی کثرت اور چہل پہل تھی، شستہ اور محتاط مقررین کی تلاش رہتی تھی، اس سلسلہ میں تازہ وارد نوجوان بہادر خاں کی حوصلہ افزائی پر حوصلہ افزائی کی گئی ۔ پہلی تقریر بمقام لال دروازہ ہوئی میلاد کا جلسہ تھا، ہزارہا مسلمان جمع تھے جب اور مقرروں نے اپنا اپنا فرض ادا کیا تو ایک نوجوان تختِ خطابت پر ایستادہ ہوا اور آیہ "ان کنتم تحبون اللہ الخ" پر وجد آفریں تقریر شروع کی، اندازِ بیان، ترکیب و بندش کی چستی، معانی کی فراوانی کم عمری میں پختگی اور کہنہ مشقی کے آثار دکھا رہی تھی، اس اعجاز بیانی نے سب کو اپنی طرف کھینچ لیا. اور اب کوئی بڑا جلسہ بغیر بہادر خاں کی شرکت

کے نہ ہو سکا اور ہر نقش ثانی، اول سے بہتر ثابت ہوتا گیا۔

خسرو دکن کی طرف سے خطاب

اسی زمانے میں وکٹری پلے گراؤنڈ پر حیدر آباد کا ایک عظیم الشان جلسہ میلاد منعقد ہوا کرتا تھا، بیرون دکن کے ممتاز علماء بھی خصوصیت کے ساتھ مدعو رہتے اور اعلحضرت خسرو دکن بھی اس محفل میں شرکت کی سعادت حاصل فرماتے تھے، ایک سال ان کی موجودگی میں مرحوم نے "حیات طیبہؐ کی جامعیت" پر ایمان افروز اور بصیرت آفرین تقریر فرمائی جس کے ہر ہر جملہ پر صاحبان ذوق متحیر تھے اور خود اعلحضرت تاثیر میں ڈوبے چلے جا رہے تھے ـــــ، اس اثر آفرین تقریر کو سُنکر دوسرے ہی روز "بہادر یار جنگ" کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔

ابنائے ملت کی طرف سے خطابات

میلاد کی ان تقریروں سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے "لسان الامت" کے نام سے پکارا، اور جب واقعی ان کی زبان نے "لسان الامت" کا درجہ حاصل کر لیا اور مجلس اتحاد المسلمین اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ملت اسلامیہ کی صحیح ترجمانی ہونے لگی تو سب نے "قائد ملت" کے نام سے پکارا حقیقتاً یہی خطاب مرحوم کی جامع شخصیت کا آئینہ دار تھا اور اسی لئے اخیر عمر تک یہی مقبول رہا۔

ہم عصر خطیبوں میں امتیاز

بہادر یار جنگ کے معاصر خطیبوں میں سب سے ممتاز مولانا ابوالکلام آزاد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ ان کے علاوہ مولانا آزاد سبحانی مولانا شبیر احمد عثمانی اور نوجوان مقرروں میں مولانا جمال میاں فرنگی تھے۔

مولانا آزاد بلاشبہ ایک شعلہ بیان خطیب تھے سطوتِ ذاتی بھی رکھتے تھے ان کی زبان اور اُن کے لہجہ میں خطیبانہ شوکت وصولت بھی تھی اور برجستہ و برموقع اشعار کے ذریعہ تاثیر بیان کو تیز تر کرنے کا مولانا کو خاص ملکہ تھا، علمی اعتبار سے بھی ان کے خطبات ایک وَزن رکھتے تھے. مگر بحیثیت خطیب انمیں بڑی کمی اُن حرکات وسکنات کی تھی جو ایک عظیم مقرر کا خاص حربہ ہوتی ہیں ـــــ جس وقت بہادر یار جنگ کی تقریروں کا ان ہندوستان بھر میں غلغلہ تھا، مولانا خاموش ہو چکے تھے.

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری مسلّم خطیب تھے، زبان، بیان، سطوتِ ذاتی اور حرکات وسکنات کی ساری خوبیاں ان کی خطابت میں جمع تھیں، آواز بھی بُلند اور دِلکش تھی، مگر ایک تو ان کا موضوع محدود اور خاصکر رَدِّ قادیانیت تھا یا پھر "احراری" ہونے کی حیثیت سے نیشنلزم کی تائید! اور دوسرے یہ کہ وہ عوام کو مسحور رکھنے کے لیے ان کی سطح پر اُتر کر تشبیہہ وتمثیل سے کام لیتے تھے جس سے متانت ووقار اور علمی سنجیدگی کو ٹھیس لگتی تھی.

مولانا آزاد سبحانی. کامیاب خطیب تھے، مگر زبان وبیان قدیم ماہرین معقولات کا تھا، استدلالیت زبردست تھی مگر خالص فنی اور عوام کی فہم سے بالاتر ـــ اسی لئے صرف اہل علم کے کام کے تھے، نفوذ ذاتی نہ تھا.

مولانا شبیر احمد عثمانی. شیریں دہن اور پُر اثر خطیب تھے. تقویٰ وطہارت کی وجہ سے ان کے اندر نفوذ ذاتی بھی تھا. تقریر علمی اعتبار سے بلند اور تفہیم کے اعتبار سے سلیس وشستہ ہوتی تھی، درمیان درمیان میں اکبرؔ کے اشعار اور لطائف لاکر مجمع کو متاثر کرتے اور ہنسا دیتے تھے، طرزِ بیان واعظانہ زیادہ اور خطیبانہ کم تر تھا. خطیبانہ حرکات وسکنات سے کام

نہ لیتے تھے۔

مولانا جمال میاں فرنگی محلی ۔ہندوستان کے نوجوان خطیبوں میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ نفاست زبان۔ رَوانیٔ بیان اور طنز ملیح ان کی خطابت کے خاص اوصاف تھے، مگر شخصیت کا شکوہ، جو محض عطائے ربانی ہے، ان میں نہیں، تحریک پاکستان کو برقانہ میں مولانا کی تقریروں کا ناقابل فراموش حِصّہ رہا مگر پاکستان بننے کے بعد وہ زاویۂ خمول میں چلے گئے۔

بہادر یار جنگ ۔پُرشکوہ شخصیت اور مومنانہ بُلند کرداری کی وَجہ سے زبردست "سطوت" اور "شخصی نفوذ" رکھتے تھے۔ ان کی آواز بہت بُلند مگر نہایت دِلکش تھی، زبان وبیان فصاحت وبلاغت کے جواہر سے مرصع اور تقریر عام فہم ہونے کے باوجود پُرمغز، اور علمی نکات واشارات سے پُر ہوتی تھی، راقم الحروف کو چونکہ فن خطابت سے دِلچسپی رہی ہے اور اس فن کی کچھ کتابیں بھی دیکھی ہیں۔ اس لئے میں بِلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ خطیبانہ حرکات وسکنات بہادر یار جنگ سے زیادہ صحیح اور بے ساختہ کہیں دیکھنے میں نہیں آئے اور بعض نہایت پُر وقار اور موثر حرکات کے تو وہ خود موجد بھی تھے ——— ان کو اس بات پر پوری قدرت حاصل تھی کہ وہ جب چاہیں مجمع کو ہنسا دیں، رُلا دیں یا دم بخود کر دیں جو لوگ ان کی تقریروں میں شریک رہے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ جب وہ مجمع کو کسی بات کی دعوت فکر دیتے تو ان کے ذہنوں کو اپنی طرف اس قدر منجذب کر لیتے تھے کہ سَانس کی آوازیں سُنائی دینے لگتیں، پھر مبہوت مجمع کو دفعتہً وہ خود چونکا دیا کرتے تھے۔

تفہیم کا ملکہ ایسا تھا کہ وہ مشکل سے مشکل مسئلہ پانی پانی کر کے بیان کر دیتے اور عوام کو سمجھانے کے لئے کبھی اُن کے مذاق ومزاج کی پست سطح

پر اثر نہیں آتے تھے بلکہ اپنی قوت انجذاب سے ان کو اوپر کھینچ لیتے تھے۔

موزوں اشعار کا برجستہ استعمال خطیب کا خاص کمال ہوتا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور بہادر یار جنگ اس کی کمالی مثالیں تھے، نواب صاحب کو اقبال کے اشعار سے خاص شغف تھا۔

غرض اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ اپنے عصر کے سب سے بڑے خطیب اور عجم کی تاریخ خطابت میں امتیازی مقام کے حامل تھے۔

ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

چودھری خلیق الزماں کی تائید

چودھری صاحب اپنی کتاب شاہراہ پاکستان میں قائد ملت کی اسی خطیبانہ برتری سے متعلق لکھتے ہیں :۔

"خلافت کے دور میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبد الحامد بدایونی اور مولانا عطار اللہ شاہ بخاری بڑے آتش فشاں مقرر تھے مگر جس قسم کی گہر باری اور تاریخی دولت مسلمانوں کو نواب بہادر یار جنگ کی تقریروں سے ملتی تھی وہ کسی کے حصے میں نہیں آتی تھی، زبان کی لطافت، خیالات کی پاکیزگی اور نزاکت الفاظ کی بندش، اُن کا تسلسل سب مل کر ایک معجزہ تھے، مسلم لیگ کے اجلاسوں میں وہ سب سے آخر میں بولتے تھے اور گھنٹوں لوگ مبہوت سنتے تھے"

(ص ۸۳۸ عنوان "میرا دورہ حیدرآباد دکن)

خطابت کے چند نمونے

مرحوم کی اعلیٰ خطابت کے چند نمونے بعض حقائق کے ثبوت میں

گذر چکے ہیں، چند اور درج ذیل ہیں:-

آل انڈیا تبلیغ کانفرنس سے خطاب ہے ——— "محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سُناتے ہوئے حکم "فاصدع بما تومر" کی تعمیل میں آمادۂ اشاعتِ پیغامِ الٰہی ہو جانے والو! یہ وہ راستہ نہیں ہے جس سے آبلہ پائی کے بغیر گذر جاؤ، یہ وہ لقمہ نہیں ہے جو حلقوم کو زخمی کئے بغیر ہضم ہو جائے یہ وہ منزل نہیں ہے جو ہفت خوان کو طے کئے بغیر ہاتھ آ جائے۔ یہاں ترغیب کی سنہری زنجیریں ہیں اور ترہیب کی آہنی طاقتیں، کبھی مکّہ کی ساری دولت ڈھیر کی جا رہی ہے، قریش کی ساری مہوشیں جمع ہیں اور عرب کا تخت آراستہ کیا جا رہا ہے تو کبھی بدر کا بدلہ لینے کی قسمیں کھائی جا رہی ہیں، تلواریں صیقل ہو رہی ہیں، نیزوں کے پھل گھسے جا رہے ہیں اور تیروں کے پیکان آزمائے جا رہے ہیں ——— یہاں اُن آہنی قدموں کی ضرورت ہے اور اس کوہ صفت ارادہ کی جو شمس و قمر کی تسخیر کو ٹھکرا دے، جو طوفانِ مصائب کے سامنے گردن تانے کھڑا ہو، جو پیشانی میں زرہ کی کڑی چبھونے تیار ہو جائے، جو دانت کے ٹوٹنے پر مسکرا دے اور جو گھر بار لٹا کر شکر کرے ———"

(۲) "علماء کی مجالسِ درس اور صوفیا کے حلقہ ہائے ذکر مبلغین کی مستقل تربیت گاہیں ہوتی تھیں، جہاں کے فراغت یافتہ کلیم توکل کاندھوں پر ڈالے اور عصائے توحید

ہاتھوں میں لئے دنیا کی پہنائیوں میں پھیل جاتے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوؤں کو پیغام ربانی سناتے تھے، انہی گلیم پوشانِ تخت نواز میں سے ایک سنجر کی آبادیوں سے چلتا ہے، حبشت کے میدانوں سے گذرتا ہے، خیبر کی وادیوں کو طے کرتا ہے اور سرزمین ہند کے قلب میں جم جاتا ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلیٰ اتباعہٖ"

---

(۳) دار السلام (حیدر آباد) کے پچاس ہزار کے جلسہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ (۱۳۵۹ء کے سالانہ اجلاس اتحاد المسلمین میں)

"اب بتاؤ کہ تم خود کیا کرنا چاہتے ہو؟" (جواب ملا کہ ہم آپ کے لئے جان دینے کو تیار ہیں) اس پر فرمانے لگے ——

"میرے لئے جان دے کر اپنی موت کو مردار نہ کرو، جو غیر اللہ کے لئے جان دیتا ہے وہ مردار موت مرتا ہے، اور تمہاری جان کی اس وقت کوئی ضرورت نہیں —— میرے آشیانہ پر بجلی چمک رہی ہے، اس کو جل جانے دو، تمہارے لئے یہ مبارک فال ہے۔ یہی ابر تمہارے گلشنِ حیات پر برسیں گے اور بہت جلد اس میں بہار آئے گی۔ میں اُجڑے ہوئے آشیانے کی خاکستر پر بیٹھا اس بہار کا لطف اٹھاؤں گا — ہوائیں چل رہی ہیں۔ ابر چھٹیں گے۔ آفتاب اُمید چمکے گا۔ اور دنیا دیکھے گی کہ حق ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور باطل کے پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اُڑتے ہوئے نظر آئیں گے —— (حکومت کی طرف سے ترہیب کے جال بچھائے

جا رہے تھے)

---

(۴) ۱۳۵۸ھ کی صدارتی تقریر میں، جلسہ سالانہ مجلس اتحاد المسلمین منعقدہ دارالسلام میں، آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے قیام پر اعتراض کا جواب دے رہے ہیں:۔

"میں خود اس کا قائل رہا ہوں کہ حیدرآباد ایک مستقل سلطنت ہے، اس کی تاریخ اور اس کے روایات اس کے لئے ایک بالکل جُداگانہ ماحول پیدا کرتے ہیں، اور کسی کو حق نہیں کہ اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے لیکن گزشتہ دو سال میں اندازہ ہوا کہ اپنی انتہائی خوبی کے باوجود یہ نظریہ ہمارے لئے ایک دھوکا ثابت ہو رہا ہے ——— ہندوستان کے وسیع سمندر میں موجیں اُٹھ رہی ہیں، طوفان آ رہے ہیں، سطح مرتفع دکن کی خاک کے ذرّے ان طوفانوں کو خود آگے بڑھ کر دعوت دے رہے ہیں اور کشتیِ دکن کے نام نہاد ناخدا ان طوفانوں کو اُٹھتا دیکھ کر لرزہ براندام، حیات سے مایوس اور دامِ موج کے پہنچنے سے پہلے کشتیِ حیات کو غرق کر دینے پر مائل نظر آتے ہیں۔ مسافروں کو تھوڑی دور پر چٹان نظر آ رہی ہے اور وہ اس پر چڑھ سکتے ہیں، لیکن بیرونی طوفان کو دعوت نامہ لکھنے والا ہاتھ ان کو روکتا ہے کہ خبردار غیر کی اعانت حاصل نہ کرنا ——— میں کہہ چکا ہوں کہ حیدرآباد کی انفرادیت اور استقلال کی بقا ضروری ہے میں آج بھی

اس کو اپنے مقاصد حیات میں سے ایک سمجھتا ہوں اور کوئی
ہرج نہیں سمجھتا کہ اپنی اس انفرادیت اور استقلال کو مضبوطی
سے قائم رکھتے ہوئے وہ دوسروں کی طرف تعاون واشتراک
کا ہاتھ بڑھائے۔"

---

(۵) مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کراچی (جنوری ۱۹۴۴ء) کے آخری جلسہ کی تقریر تو پوری کی پوری فن تقریر کا شاہکار ہے (مع اپنی معنوی بلاغتوں کے) لیکن صرف ایک فقرہ درج ذیل ہے :۔

مرحوم نے جب دورانِ تقریر فرمایا کہ میں جس دن اپنی جان و مال نچھاور کردوں گا وہی دِن میری انتہائی مسرت کا دِن ہوگا (کونسل آف اکشن کی قرارداد کے سلسلہ میں یہ اظہار کیا گیا تھا)، تو مجمع بھی ہم نوا ہو گیا۔ اس موقع پر مرحوم نے ان کو ٹوکا اور کس موثر پیرائے میں فیصلہ پر نظر ثانی کا مشورہ دیا :۔

"اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجیے۔ میں نے اپنے جس عزم کا اظہار آج
کیا ہے وہ میری بارہ یوم کی شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے،
میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔
جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو اپنے بچوں کی مسکراہٹوں
کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو۔ اپنی تجارت و ذرائع
معاش کی ساری تباہیوں کا تصور کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو۔
مسلمانو! وہ تصفیے جو جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید
میں کر دیئے جاتے ہیں بسا اوقات آنی اور اسی لئے فانی

ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں جو شجر ملّت پر پھول بَن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھل بَن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بنیں جو زمین میں جذب ہوتی ہے اور جڑوں کو مضبوط کرتی ہے، جو مٹی اور پانی سے مِل کر رنگین پھول پیدا کرتی ہے، جو خود فنا ہوتی ہے اور پھلوں میں لذّت و شیرینی پیدا کرتی ہے —— ہم کو ان کی ضرورت نہیں جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بَن کر نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں، ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اُوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہوں میں نے کل کہا تھا اور آج پھر سُنا دینا چاہتا ہوں ؎

ایسی کوئی دنیا بھی ہے افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کےؔ"

کِس تقریر کے کون کون سے حِصّہ کو نقل کیا جائے؟ اِنتخاب آسان نہیں بہت مشکل ہے! جس مقام کو دیکھو۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

تفصیل کے لئے اخباروں کے صفحات "سیاسی تقاریر قائدِ ملّت" والی کتاب موجود ہے مگر افسوس کہ ان تقاریر میں اصل کا رنگ بہت ہی مدہم ہے، پھر مقرر کے چشم و ابرو کے اشارات کی عکاسی کون کر سکے جن سے تقریر میں جان پڑتی ہے۔

خُطباتِ بہادر یار جنگ کے اثرات

مرحوم کی ان جادو بیانیوں کا اثر کیا ہوتا تھا؟ مولانا جمال میاں فرنگی محلی سے پوچھئے موصوف نے مجلس اتحاد المسلمین کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے نواب مرحوم کی بڑی پیاری اور صحیح تعریف فرمائی تھی۔ فرمایا کہ :۔

"اس سے بڑھ کر نواب صاحب کی اور کیا تعریف کی جائے کہ جب تقریر ہو چکتی ہے تو ہزاروں بے نمازی نمازی ہو جاتے ہیں ہزاروں راہ گم کردہ، راہِ راست پر آجاتے ہیں، ہزاروں بے عمل، عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، اس کا مشاہدہ خود میری آنکھوں نے بارہا کیا ہے! "وعظ گوئی" پر نواب صاحب کا بڑا احسان ہے کہ ان کی تقاریر کی وجہ سے جو دراصل وعظ[ا] ہی ہوتی ہیں، وعظ کا گرا ہوا معیار پھر انتہائی بُلند ہو گیا، یا تو یہ عالم تھا کہ انگریزی پڑھے لکھے مذہبی باتیں سُننا گوارا ہی نہ کرتے تھے یا اب یہ ہے کہ نواب صاحب کی تقاریر کی وجہ سے ہر ایک ان کو بڑی دلچسپی اور تن دہی سے سُنتا ہے اور ان کی ٹوٹی پھوٹی تقلید کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے۔"

مولانا فرنگی محلی کی اس تعریف کا ایک ایک لفظ صداقت و حقیقت میں ڈوبا ہوا ہے — یہ انھیں کی تقریروں کا اثر تھا کہ حیدر آباد کے

[ا] لغوی معنی میں نہ کہ عرفی اور اصطلاحی معنی میں!

اعلیٰ عہدہ دارانِ سلطنت اور جامعہ عثمانیہ کے عام پروفیسر بھی جب مخاطب کرتے تو ایک آدھ مذہبی بات کہتے ہوئے انتہائی فخر محسوس کرنے لگے تھے، راقم الحروف بی۔ اے کے آخری سال میں تھا، خوب یاد ہے کہ ہمارے معاشیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی اور سیاسیات کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہارون خاں صاحب شروانی اسی اثر کے ماتحت اپنے لیکچرز میں اسلام اور اس کے نظریوں کا ذِکر بھی کرنے لگے تھے ــــ بلکہ خود ڈاکٹر انور اقبال صاحب بھی اس سے اِنکار نہ کر سکیں گے کہ ان کی کتاب "اسلام اور سود" بہادر یار جنگ ہی کے گہرے اثرات کا نتیجہ ہے،

دوسرا زبردست اثر اردو زبان کی ترویج اور اس کے معیار کی بُلندی پر پڑا۔ "لسان الامّت" کی تقریروں کی وجہ سے سارے ہندوستان میں اُردو بولنے کا ذوق اور فصیح زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، جس کا اعتراف مولوی عبدالحق بابائے اُردو کو بھی تھا۔

○

خدماتِ علمیہ

و

طرزِ اصلاح

*

تاریخ اسلام پر نظر

"تاریخ اسلام" اور "مسلمانوں کی تاریخ" مرحوم کا خاص موضوع تھا۔ اس فن کا انھوں نے غائر مطالعہ فرمایا تھا، عمیق فکر کی تھی اور خوب سمجھتے سمجھاتے تھے دار المصنفین ندوۃ العلماء کی کتابوں سے لے کر اصل ماخذ تک سارا تاریخی دفتر ان کی نگاہ میں تھا۔ اور ذہن میں اچھی طرح محفوظ تھا، عام لوگوں کی طرح صرف واقعات پر نظر نہ تھی بلکہ ان کے اسباب و علل پر خاص توجہ رہتی، قوموں کے اُتار چڑھاؤ اور ان کی نفسیات کا بہت باریک بینی سے پتہ چلاتے تھے۔

خاکسار تحریک میں شرکت کے زمانہ میں بعض نوجوانوں کے اصرار پر "تاریخ اسلام" کا درس بھی دیا کرتے تھے، ہفتہ میں ایک بار "بیت الامت" میں شوقین حضرات جمع ہوتے اور مرحوم پوری مورخانہ شان سے تاریخ سُنایا کرتے تھے! "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی رو سے مرحوم نے "تخلیق آدم" سے تاریخ اسلام کی ابتدا فرمائی، ماورائے ارضی حقایق کو پیش فرمایا اور پھر آدم علیہ السلام کے اس جہاں میں آنے کی تاریخ شروع فرمائی۔ استدلال میں آیات قرآنی سے کام لیتے تھے، لیکن حضرت آدمؑ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک نہ تو کوئی مسلسل تاریخ ملتی ہے،

اور نہ کلام پاک اس کی تفصیلی رہبری فرماتا ہے، اس طویل دور میں (آدم تا بعثت خاتم المرسلینؐ) بعض تاریک ادوار آتے ہیں! ایک مؤرخ کا کام ہی تو ہوتا ہے کہ ایسے دور کے متعلق اس کے گذشتہ اور آئندہ حالات کو پیش نظر رکھ کر قیاس قائم کرے، جس کی نظر جتنی عمیق ہوگی قیاسات بھی ویسے ہی اعلیٰ اور حقیقت سے قریب تر ہوں گے، مرحوم اس حیثیت سے ایک بہترین مؤرخ تھے اور قیاس آرائی میں کمال رکھتے تھے — تاریخ سناتے ہوئے قوموں کے اتار چڑھاؤ کے اسباب کی خاص طور پر توضیح فرماتے اور موجودہ حالات سے اس کا مقابلہ کرکے حقیقت حاضرہ کو بے نقاب فرماتے تھے —— مثلاً بنی اسرائیل کے واقعہ ہجرت پر پہنچے تو فرمایا کہ جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی تو انھوں نے اپنی قوم کو سنا دیا کہ ہجرت کرنا ہے، بنی اسرائیل یوسف علیہ السلام کے زمانے سے مصر میں آباد تھے موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، موسیٰ علیہ السلام اتنی کثیر تعداد کو لے کر راتوں رات کیسے نکل سکے ہوں گے؟ حمل ونقل کی دشواریاں، غربت اور کثرت! ایسی حالت میں اتنی تعداد کا شہر سے نکل جانا اور پھر کسی کو خبر نہ ہونا کس قدر تعجب کی بات ہے! حالانکہ فرعون کی فوج اور اس کی سی آئی ڈی. ان کی تاک میں تھی اور بعض روایات کے بموجب وہ بنی اسرائیل کے عید کا دن تھا، ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے صبح تک کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی اور پتہ لگتا ہے تو اس وقت جبکہ وہ بحر احمر کے کنارے پر پہنچ چکے ہوتے ہیں! کیا کوئی جادو تھا یا معجزہ؟ — دیکھا گیا ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے غلامی مستولی ہوتی ہے، اس پر اتنا خوف طاری رہتا ہے کہ وہ کوئی بات علی الاعلان نہیں کر سکتے، کانا پھوسی یا جسے عربی میں "نجویٰ" کہتے ہیں.

کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، اور یہ قوم کی انتہائی پستی کی علامت ہے۔

موجودہ مسلمان ابھی اس حد سے بہت دور ہیں "پدرم سلطان بود" کہہ کر اب بھی ہر کام شور و غوغہ سے کرتے ہیں، لیکن کام کم ہے آواز زیادہ؛

اسی طرح قارون کے خزانہ کا ذکر اور اس کے زمین میں دھنس جانے کا واقعہ آیا تو توضیح فرمائی کہ دولت یا تو خدا کی۔

(۱) عطا ہوتی ہے

(۲) سزا ہوتی ہے

(۳) یا بلا (امتحان) ہوتی ہے

غرض جو بھی واقعہ بیان کیا جاتا اس سے حال کو سنوارنے کے سامان ضرور فراہم کئے جاتے

درس تاریخ کا یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا تخلیق آدم ؑ سے حضرت عمر رضؓ کے دور تک تاریخ بیان کی جا چکی تھی کہ مجلس اتحاد المسلمین کی گوناگوں مصروفیتیں اس میں حائل ہوئیں اور سلسلہ ٹوٹ گیا، بعد میں لوگوں کے اصرار سے مرحوم نے پھر اس کے احیاء کی کوشش فرمائی مگر فرصت نے ہمیشہ مخالفت کی۔

مرحوم کی "تاریخ اسلام" پر دقت نظری کے سب قائل تھے۔ چنانچہ کل ہند تاریخ اسلام کانفرنس کے جلسوں میں اُن کی کئی تقریریں ہوئیں اور اس کا ایک اجلاس حیدر آباد میں مرحوم کی صدارت ہی میں ہونے والا تھا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر ملتوی ہو گیا۔

قرآن سے عشق

مرحوم کو قرآن سے اُنس نہیں عشق تھا اور اس کا ثبوت اپنے عمل سے عُمر کے آخری لمحوں تک پیش کرتے رہے بچپن میں خدا ترس نانی کی قرآن نہ پڑھنے پر خفگی (کہ "تم نے آج اللہ سے باتیں نہیں کیں، میں تم سے بات نہ کروں گی")، نے یہ حقیقت ذہن نشین کرا دی تھی کہ قرآن (نعوذ باللہ) کوئی منتر جنتر نہیں جسے رٹ کر مقصود حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، جنھیں خوب سمجھنے کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر سمجھے عمل کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور اور جب تک عمل دُرست نہ ہو اللہ تعالیٰ کیسے راضی ہو جائیں گے؟—
سعادت مند نواسے نے اپنی نانی کی نصیحت پر عمل شروع کیا، قرآن کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی، علماء سے استفادہ کیا۔ تفاسیر کا مطالعہ کیا۔
یہ سب کچھ ہو رہا تھا کہ ایسے میں ایک رازدانِ حقیقت نے آواز دی:—

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف" اقبالؒ

آیت کو خود پر طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے اور آنکھیں کھُل گئیں حقیقت وا انکشاف ہو گئی۔ اب ایک بالآخر یہی حال بن گیا جس کی مثالیں بہت سوں نے دیکھیں۔
ایک دفعہ ایک مسجد میں نماز کے لئے آئے کسی قاری صاحب نے

قرآت سُنانے کی خواہش ظاہر کی۔ مرحوم کے لئے اس سے زیادہ دِلچسپ اور کیا چیز ہوسکتی تھی، فوراً سُننے پر آمادہ ہوگئے قاری نے "والضحیٰ" کی سورت تلاوت کرنی شروع کی، تھوڑی ہی دیر میں ہمہ تن گوش قاید کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، سورۃ ختم ہوئی تو سسکیاں لیتے ہوئے فرمایا "پھر پڑھئے" دوبارہ پڑھی گئی، ارشاد ہوا "پھر سنائیے" مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں مجھ ہی پر نازل ہورہی ہیں اور گویا میری ہی زندگی کا نقشہ اس میں کھینچا گیا ہے" —— قاری صاحب نے کوئی آٹھ دس بار یہی سورۃ سُنائی تب کہیں دِل کو جاکر کسی قدر قرار آیا اور سیلاب اشک تھمنے لگا۔

تفسیر بیان کرتے ہوئے اس کیفیت کا مشاہدہ تو بارہا ہماری آنکھوں نے کیا، کتنی دفعہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کھُلا، ابھی صرف ایک نظر ہی آیتوں پر پڑی تھی کہ دِل کی کیفیتیں آنکھوں کی زبانی ظاہر ہونے لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے سِسکیاں بندھ گئیں اور جب کافی وقت گذرنے پر بھی قابو نہ حاصل کیا جاسکا تو اسی حالت میں گھر کی راہ لی —— قرآن سے شغف کی ایسی مثالیں نادر ہی ہیں!

تجوید سے شغف

قاری روشن علی صاحب نہ صرف حیدرآباد کے ممتاز قاری اور اُستاد فن تھے بلکہ ان کی شہرت عرب تک پہنچ چکی تھی، اپنے فن کے یکتا و یگانہ تھے۔ مرحوم نے فن تجوید اُن ہی سے حاصل کیا تھا اور خوب واقف تھے، یہی وجہ ہے کہ اکثر قاری صاحبان مرحوم سے داد حاصل کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے تھے —— اس فن سے مرحوم کی دِلچسپی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہر سال ماہ صیام میں ایک رات "بیت الامت" میں محفل قرآت ہوتی

ہوتی جس میں ملک کے بڑے بڑے اہلِ فن اور شائقین قرآت و تجوید جن میں نواب مقصود جنگ بہادر طبیب شاہی کا نام سرفہرست ہوتا تھا، جمع ہوتے اور اپنے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے ــــــ اس کے علاوہ بعد میں ایک ایسی ہی محفل قرآت رجب میں معراج کی شب کو بھی منعقد ہونے لگی تھی، جس کا ذِکر خود مرحوم کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۴۲ء کو اپنے استاد گرامی قاری محمد روشن علی صاحب (مرحوم) کی خدمت میں لکھتے ہیں:

"استاد محترم مدظلہ۔ مجھے بالکل یاد نہیں رہا کہ میں نے ہر شب معراج کو مجلس قرار کے انعقاد کا ارادہ کر لیا تھا، معراج کی شب بہت قریب ہے اس لئے براہ کرام آج قرار کی فہرست روانہ فرما کر ممنون فرمایئے تاکہ ان کے نام دعوت نامے جاری کر دیئے جائیں، اس محفل کی کامیابی کا تمامتر دار و مدار حضرت کی توجہ پر ہے اور میں خاص توجہ کا اُمیدوار ہوں، حسب سالِ گذشتہ میں مجلس قرآت قرآن مجید کے انعقاد کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔"

(مکتوب ۳۲۹۔ مکاتیب بہادر یار جنگ)

درس تفسیر

مرحوم نے اپنی مسجد میں روزانہ بعد نماز فجر ایک گھنٹہ تفسیر سنانے کا اہتمام کر رکھا تھا، سوائے ان دنوں کے جن میں مرحوم حیدرآباد سے باہر ہوتے، روزانہ یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، فرماتے تھے کہ

"مجھے اگر کسی عمل کے صلے میں بخشش کی توقع ہے تو وہ یہی قرآن کی خدمت ہے۔"

چلچلاتے ہوئے جاڑوں میں پریشان کن گرمیوں اور موسلا دھار بارش میں یہ عیش کا پروردہ، دولت کا آفریدہ نواب محض اللہ کے لئے ایک چھوٹی مسجد میں چٹائی پر بیٹھے، اپنے آقا کے کلام کو سمجھایا کرتا تھا، نواب صاحب کے امیر دوستوں نے اور خود نظام حیدر آباد نے یہ باور کرایا کہ یہ تمہارا مقام نہیں کہ اس طرح محلہ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں بیٹھے تفسیر بیان کیا کرو، خود بھی فرماتے تھے کہ "یہ میرا مقام نہیں"، لیکن دونوں کے کہنے کہنے میں فرق زمین و آسمان کا تھا ـــــ وہ منع کرتے تھے اس لئے کہ چٹائی پر بیٹھنا، عوام سے اس طرح ملنا، جاگیرداریت کے خلاف ہے، اور نواب صاحب کے فرمانے کا منشا یہ تھا کہ مُفسر کا مقام بہت بُلند ہوتا ہے۔ میں اس مقام کا خود کو اہل نہیں پاتا میں تو صرف تفسیر سُناتا ہوں۔ اسی وجہ سے بارہا فرمایا کہ:۔

"میں تفسیر بیان نہیں کرتا بلکہ تفسیر سُناتا ہوں، میں تفاسیر دیکھنے کا عادی ہوں اور یاد رکھنے کے لئے روزانہ صبح پڑھی ہوئی چیزوں پر غور کرلیا کرتا ہوں، خیال ہوا کہ اگر یہی کام مسجد میں ہوا اور بجائے خاموش سوچنے کے بآواز بُلند کہتا جاؤں تو دوسروں کا بھی فائدہ ہوگا، بس اسی وجہ سے یہاں بیٹھ کر کہنا شروع کردیا ہے۔"

ان الفاظ میں نہ انکسار تھا نہ تصنع، وہ اپنے قول میں صادق تھے، اسی لئے ہزاروں لاکھوں کے مجمع کا خطیب صرف پندرہ بیس آدمیوں کے درمیان ایک گھنٹہ تک بلاناغہ تفسیر بیان کیا کرتا تھا، انھیں اس کا خیال ہی نہ تھا کہ کتنے لوگ آرہے ہیں، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ صرف راقم سوانح اور موذن دو ہی سامعین رہے لیکن مرحوم برابر تفسیر سُناتے رہے

اور اسی انشراح سے مطالب قرآنی بیان کرتے رہے، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، جس کی تقریروں کے لئے ہزاروں کی تعداد میں لوگ دوڑے دوڑے چلے آتے ہوں اس کا دو ایک افراد کے آگے اس مستقل مزاجی سے قرآن سناتے رہنا نفسیاتی اعتبار سے بڑا مشکل کام تھا۔ مرحوم کو شکایت ضرور تھی کہ "وہ لوگ جو میری تقریروں کو ایسی دلبستگی سے سننے کے عادی ہیں، تفسیر میں کیوں شرکت نہیں کرتے، حالانکہ میری یہ گفتگو ہر تقریر سے اچھی اور مفید ہوتی ہے" لیکن عملاً یہ ممکن نہ تھا، بالعموم لوگوں کو صبح اپنے کاموں سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ ایک گھنٹہ تفسیر کے لئے نکال سکیں، البتہ رمضان کے مہینے میں مسجد کھچاکھچ بھر جاتی تھی، اور اس قرآن کے مہینے میں سنانے والے کا رنگ بھی خاص رہتا تھا ویسے مطالب و معانی کی فراوانی کب نہ ہوتی تھی، اندازِ بیان دلکش و دلنشین کب نہ ہوتا تھا، لیکن اس مہینے میں کیف واثر دو بالا ہو جاتا تھا۔

مرحوم فرماتے تھے اور بجا فرماتے تھے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کو قرآن سے آشنا کرانا ہے۔ ایک مرتبہ درس تفسیر ختم ہونے کے بعد حسب عادت دعائے ماثورہ (اللھم ارحمنا بالقرآن العظیم) پڑھی نہ معلوم کیا خیال آیا کہ گریہ طاری ہو گیا فرمانے لگے :-

"خانۂ خدا میں بیٹھے، کتاب اللہ کو ہاتھ میں لئے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میری تقریروں، جلسہ آرائیوں اور ہمہ ہمی کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ قرآن کو سمجھنے لگیں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں، اگر مسلمانوں نے اس کو (قرآن) چھوڑ دیا تو وہ کہیں کے نہ رہیں گے، یہی ان کی پناہ گاہ ہے۔"

اس کی عملی ترویج کی صورت یہ نکالی کہ مجلس اتحاد المسلمین کے ہر عہدہ دار اور عام مسلمانوں پر یہ فرض گردانا کہ روزانہ کم از کم تین آیتیں ترجمہ کے ساتھ تلاوت کیا کریں۔ اپنی شاخوں کو ہدایت دی کہ ہر جگہ مسجد میں قرآن کو ترجمہ سے سُنانے یا تفسیر بیان کرنے کا انتظام ہونا چاہیئے اور اپنے دوروں میں تنقیح کے وقت سب سے پہلے ہی دیکھتے تھے کہ قرآن مجید کی خدمت ہو رہی ہے یا نہیں؟

طرزِ تفسیر

اور تقریروں کے لئے تو شاید ہی مرحوم کبھی تیاری کرتے لیکن درس تفسیر کا بہت اہتمام فرماتے تھے، رات کو سونے سے قبل ایک گھنٹہ یا پھر صبح نماز فجر سے پہلے اتنی ہی دیر جن آیات کی تفسیر بیان کرنی ہوتی اُن سے متعلق قدیم و جدید تفاسیر کا غائر مطالعہ فرماتے تھے، ــــ اور تفاسیر کا ذخیرہ مرحوم کے پاس تھا بھی بہت کافی، قدیم تفاسیر سے لے کر جوہری طنطاوی جیسے حالیہ مفسرین کی کتابیں سب موجود تھیں، اردو تراجم بھی سب ہی زیر نظر رہتے تھے ــــ اسی تیاری اور اہتمام کا نتیجہ تھا کہ درس میں بڑے بڑے کلامی مسائل حل ہوتے، فلسفہ کی گتھیاں سُلجھائی جاتیں، فقہ کے نکات بیان کئے جاتے اور عارفانہ باتیں بھی سُنائی جاتی تھیں۔ ــــ راقم الحروف کے عرض کرنے پر بعد کو آیات کی صرفی و نحوی سلیس تحلیل بھی سمجھانے لگے تھے،

بہرکیف صبح نماز فجر کے لئے مرحوم پوری سادگی سے کرتا اور کشمیری دوپلی ٹوپی پہنے شیخ الہند کے ترجمہ والی حمائل بغل میں دبائے مسجد پہنچ جاتے تھے، نماز خود ہی پڑھاتے، پھر چند منٹ مراقبہ فرمانے کے بعد کلام پاک کھول کر بڑی سادگی سے چند آیتیں تلاوت فرماتے۔

تلاوت کے بعد آیات کا ترجمہ مختلف انداز میں سناتے تھے۔ انگریزی ترجمہ بھی بتا دیتے تھے، سامعین کو ہدایت تھی کہ ہر ایک کوئی نہ کوئی مستند ترجمہ والا قرآن اپنے ساتھ رکھے، جب خود ترجمہ کر چکتے تو پوچھتے کہ کوئی ترجمہ چھوٹ تو نہیں گیا؟ پھر فرماتے کہ "میرے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ قابل ترجیح ہے آپ جسے چاہیں اختیار کریں"۔ اس کے بعد قواعد کے موٹے موٹے اصول بتا دیتے جاتے، لغات کی تشریح ہوتی، اور پھر مطالب، معانی اور مسائل بیان فرماتے تھے! — اس طرح روزانہ بالعموم ایک ہی دو آیات کی تفسیر ہو سکتی تھی، اور بعض دفعہ تو ایک ایک آیت کی تفسیر چار چار پانچ پانچ روز تک بیان ہوتی رہتی تھی، مثلاً جب یہ آیت شریف آئی "ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہ، الخ" تو صرف "اظہار دین" یعنی دین اسلام کے دیگر ادیان پر غلبہ کی تفسیر پانچ روز تک ہوتی رہی، اور عجیب معلومات افروز اور بصیرت افزا بیان رہا ——— ایک روز "تعلیمات" اسلام کے غلبہ کا ذکر ہوا، دوسرے روز "عبادات" کا تیسرے دن "فرائض ومعاملات" کا، چوتھی نشست میں "اخلاقیات" کا، اور پھر آخری دن ظاہری غلبہ کی وضاحت کی گئی اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے کہ ہمیں قرآن ختم کرنا ہے ورنہ ابھی فلسفیانہ پہلو رہ گیا، اور دوسرے نقاط نظر سے تشریح نہ ہو سکی، فرماتے تھے بڑی مشکل ہوتی ہے قرآن کے حرف حرف کا یہ عالم ہے کہ ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

اسی طرح جب یہ آیت شریفہ آئی کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بیعتِ رضوان کے سلسلہ میں لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ اللہ ہی کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر تھا (ید اللہِ فوق ایدیھم)

تو ایک نشست میں تو صرف واقعہ بیعت سُنایا گیا اور دوسرے دن اس کی ایسی بلند اور عارفانہ توضیح کی گئی کہ عام لوگوں کے لئے اس کا سمجھنا بھی دشوار تھا (چونکہ پندرہ بیس آنے والوں میں اکثریت پڑھے لکھوں کی بلکہ اس علم سے لگاؤ رکھنے والوں کی تھی اس لئے یہ مسائل بھی بعض مرتبہ بیان کئے جاتے تھے) اس آیت کریمہ کی وضاحت کسی عارف کے ان اشعار سے کی گئی۔

"من زتن عریاں شدم او از خیال
می خرامم در نہایت الوصال
صورت از بے صورتی آمد برون
باز شد انا الیہ راجعون"

غرض اسی ڈھنگ اور اسی رفتار سے تفسیر بیان ہوتی رہی اور چھ سال میں پورا کلام پاک ختم ہو سکا۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ جب کوئی سورۃ ختم ہو جاتی تو اس کا مختصر خلاصہ بھی پیش فرماتے تھے تاکہ ایک سورۃ کا اجمالی مفہوم ذہن میں محفوظ رہے، اس طریقہ سے بڑا فائدہ حاصل رہا۔ مثلاً سورۂ فتح کا حاصل۔ یہ بیان فرمایا تھا۔

(۱) "اللہ اور رسولؐ کی اتباع نے بتایا کہ ایک پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اس کا اس وقت تک ساتھ دینا چاہیئے جب تک کہ اس کی پوری پوری بے ایمانی ظاہر نہ ہو جائے۔

(۲) موجودہ کے نفع و نقصان سے آئندہ کے نقصان و فائدہ کا اندازہ پورے تدبر کے ساتھ کیا جائے۔

(۳) وقت پر حمایت سے پیچھے ہٹنے والے اور نفع کے وقت آگے بڑھنے والے اللہ کے نزدیک بہت زیادہ قابل مذمت ہوتے ہیں۔

(۴) "جو لوگ خود کو جماعت کا جزو بہتر ثابت کرتے ہیں وہ بہت مبارک اور خدا کے رحم کے قابل ہوتے ہیں"

یہ تھا تفسیر کا اندازِ بیان، ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کیا گیا کہ تاکہ فائدہ کی باتیں محفوظ ہو جائیں!

مرحوم کو اپنے اس شغل سے اتنی دلچسپی تھی کہ انھوں نے اس زمانے میں بھی جبکہ گلا جواب دے چکا تھا، آواز مشکل ہی سے نکلتی تھی اور نزلہ بُری طرح ستا رہا تھا اس میں ہرج واقع نہ ہونے دیا، لوگوں کو اپنے سے بہت قریب کر لیتے اور انتہائی پست آواز میں چشم و آبرو کو وضاحت کا آلہ بناتے ہوئے برابر ایک گھنٹہ درس دیا کرتے تھے اور یہ کہہ رکھا تھا کہ آپ لوگوں کو (یعنی شرکائے درس کو) حق حاصل ہے کہ اگر میں کبھی تساہل برتوں تو مجھے گھر سے کھینچ نکالیں۔

انتہائی خوشی کے دو دن

مرحوم کے عشقِ قرآن کا یہ عالم تھا کہ جس روز ایک پارہ ختم ہو جاتا تو بڑی ہی احسانمندی سے اللہ کی جناب میں شکر ادا کرتے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندہ سے اتنی تفسیر سنانے کا کام لیا، پھر اپنی طرف سے تمام سامعین کی مٹھائی سے تواضع فرماتے —— جب چھ سال کی طویل مدّت کے بعد قرآن مجید ختم ہو سکا تو مسرّت اور انبساط کا عالم کچھ نہ پوچھئے کہ کیا تھا! آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے، خوشی سے بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاتے تھے، اسی مسرت میں اس روز تمام سامعین کو ناشتہ پر بھی مدعو کر لیا اور پُر تکلف دعوت کی. نوکر چاکر ہوتے ہوتے بھی فرطِ مسرّت سے خود ہی سربراہی میں مصروف تھے. عشق کی بھی عجیب کارفرمائیاں ہوتی ہیں! اس موقع پر بعض لوگوں نے

پھولوں کے ہار پہنائے تو مرحوم فرمانے لگے :۔

"پہنائیے صاحب! میں آج ضرور پہنوں گا۔ میری زندگی میں انتہائی مسرت کے دو ہی دن رہے ہیں ایک وہ جب کہ طواف بیت اللہ سے مشرف کیا گیا تھا، اور ایک آج جب کہ اس کے فضل وکرم سے چھ سال تک تفسیر بیان کرتے ہوئے قرآن پاک ختم کر سکا ہوں"۔

خوشی اس وقت نہیں ہوئی جبکہ جاگیر ہاتھ آئی، خطاب سے سرفراز کیے گئے، ملّت نے اپنی قیادت سے مفتخر کیا، اللہ کے بندہ کا دِل مسرت سے اسی وقت معمور ہو سکا جبکہ اس کے گھر کے نظارہ میں مصروف تھا اور جبکہ اس کی باتیں پوری پوری سُنا چکا تھا۔۔

اسی روز جس صبح کلام پاک ختم ہوا، ایک صاحب نے عرض کیا۔ نواب صاحب یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیئے"۔ مرحوم فرمانے لگے :۔

"آپ کو یہ کیسے گمان ہو گیا کہ اب میں یہ سلسلہ ختم کر دوں گا۔ قرآن تو بار بار پڑھنے اور سمجھنے کی چیز ہے، اب کی دفعہ اسمیں اور زیادہ لطف آئے گا! اور انشاء اللہ یہ سلسلہ میری زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے گا"۔

یہی ہوا، دوسرے ہی روز سے پھر تفسیر شروع ہوئی اور اُن کی حیات مستعار کے آخری دن یعنی ۲ رجب ۱۳۶۳ھ کی صبح تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ہندوستانی مسلمان کو قرآن کا ایسا شیدائی قائد اب کہاں نصیب ہوگا۔

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

تعلیماتِ اقبال سے لگاؤ

اقبالؔ موجودہ صدی کے سب سے بڑے اسلامی مفکر، جن کی نظر مغرب کے جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کو پہنچاننے والی اور اسلام کے حقیقی نور سے آشنا، جن کی فکر نے فلسفۂ مغرب کے سارے سمندر کھنگال ڈالے لیکن کچھ نہ پایا، اور جب اسلام کے بحرِ حقیقت میں غوطہ زنی کی تو جواہر سے اپنا دامن بھر لیا، یہی متاع تھی جو وہ اپنے قافلہ میں لٹانا چاہتے تھے اور خوب لٹا گئے "اسرار و رموز" کے پڑھنے والوں سے ان کی وہ دعا مخفی نہیں کہ "اے بارالہا! اگر میں نے کوئی بات قرآن سے ہٹ کر کہی تو مجھے قیامت کے روز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پابوسی سے محروم رکھنا" — اسی طرح "ضربِ کلیم" میں "ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام" جو نصیحت لکھی ہے اس میں اس کی کافی وضاحت ہے کہ اقبال فلسفہ کی وادیوں میں برسوں سرگرداں رہے لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا، جو کچھ ملا وہ دینِ محمدی ہی میں ملا — اس اعتبار سے اقبال کو ایک گونہ مناسبت مرشدِ رومی سے حاصل ہے.... مولانا روم بھی تو اپنے زمانے کے جلیل القدر فلسفی اور علومِ عقلیہ کے ماہر تھے لیکن جب ان پر اسلام کے حقائق کھلے ہیں تو فلسفہ کی تار و پود انھوں نے بکھیر دی اور حرف حرف سے اسلامی تعلیمات کی عظمت کا اظہار فرمانے لگے، اقبال مرحوم کو خود اپنے ہم رنگِ رومی ہونے کا احساس تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"چو رومی در حرم دادم اذان من
از و آموختم اسرارِ جان من
به دور فتنہ عصر کہن اُو
به دور فتنہ عصر روان من"
(ارمغان حجاز)

مرحوم محمد بہادر خاں اقبال کی اس جامعیت سے خوب آگاہ تھے۔ اُن کے کلام کا غائر مطالعہ فرمایا تھا، قرآن وحدیث کی کسوٹی پر اُسے پَرکھ چکے تھے اور چونکہ اس میں مسلمانوں کے مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کی اعلیٰ تجویز پاتے تھے اس لئے اسے انقلاب کا صحیح آلہ تصوّر فرماتے تھے۔ مرحوم کی محبّت اور اقبال سے عقیدت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ اکثر فرماتے۔

"کسی کا ھدی کوئی اور ہو تو ہو میرا ھدی اقبال ہے"

مرحوم فرماتے تھے کہ وہ مغرب زدہ اذہان جو اسلام کے راست مطالعہ سے گریز کرتے ہیں، وہ اگر اس مغرب دیدہ اور اسلام فہمیدہ کے کلام کو پڑھ لیں۔ تو انہیں تعلیمات اِسلامی کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا، اور پھر خود اسلامی حقائق کو جاننے اور سمجھنے کی فکر کرنے لگ جائیں گے۔ اسی نقطۂ نظر سے مرحوم نے "بیت الامت" میں ہر ہفتہ درس اقبال کا سِلسلہ جاری فرما دیا تھا، جس میں پڑھے لکھے نوجوان شریک رہتے تھے، ویسے شرکت کی عام اجازت تھی۔

درسِ اقبال

مرحوم نے درس اقبال کے لئے بہترین اساتذہ کا انتخاب فرمایا تھا! ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور مولوی غلام دستگیر رشید اور خود مرحوم درس دیا کرتے تھے طرز یہ تھا کہ ہر ہفتہ جمع تو سب ہی ہوتے لیکن کوئی ایک پڑھتا جاتا اور

س کی تشریح کرتا جاتا تھا جہاں کوئی بات تشنہ رہ جاتی یا کسی کے ذہن میں کوئی اور مفہوم ہوتا تو اس کا اظہار کر دیا جاتا اور اس میں اساتذہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ سامعین بھی حصہ لے سکتے تھے — بالعموم یہ ہوتا کہ اور اساتذہ کلام کے فلسفیانہ پہلو پر روشنی ڈالتے اور مرحوم اس کی قرآنی توجیہہ فرماتے ۔ اس درس کی حقیقت ڈاکٹر رضی الدین سے سنئے :۔

سچ پوچھئے تو جس درس میں وہ (قائد ملت) شرکت کرتے، اس کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا تھا، حاضرین ایک کیف و سرور سے سرشار ہو کر نکلتے تھے۔ بقول ان کے جب وہ اقبال کے کسی شعر پر "نمک مرچ" لگانا شروع کرتے اور بات میں بات نکلتی جاتی تو دنیا بھر کے مختلف مسائل پیش نظر ہو جاتے — اقبال کے کلام کا ایسا مطالعہ شاید کیا یقیناً کہیں اور نہیں ہوا ہوگا۔ مرحوم خود اقبال کی تعلیم اور ان کی تمناؤں کا مجسّم نمونہ تھے۔ اور درس اقبال کے وقت جب وہ نظروں کے سامنے ہوتے تو پھر اقبال کے بہت سے اشعار از خود واضح ہو جاتے تھے۔ اور ان اشعار میں ایک نیا لطف محسوس ہونے لگتا تھا"

(تنظیم قائد ملت نمبر)

مرحوم کے عمیق مطالعہ قرآن و حدیث کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود تیاری کی فرصت نہ ملنے کے جب درس اقبال میں شریک رہتے تو اشعار کی تشریح میں بلا تکلف آئتیں اور حدیثیں پیش فرماتے چلے جاتے تھے — مرحوم کے انداز تفہیم کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پیش ہے :۔

اقبال کی مشہور مثنوی اسرار خودی پڑھی جا رہی تھی، یہ شعر آیا،

طبع مسلم از محبت قاہر است
مومن از عاشق نہ باشد کافر است

ڈاکٹر رضی الدین فرمانے لگے: "نواب صاحب یہاں تو اقبال نے شاعری کی ہے، اتنا سخت فتویٰ، میں نہیں سمجھتا کہ دیا جا سکتا تھا، شاید اس کا کوئی ثبوت قرآن میں نہیں ملتا"

نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "جی نہیں ڈاکٹر صاحب اقبال کوئی بات قرآن سے ہٹ کر نہیں کہتے، دیکھئے آیت شریف ہے، والذین آمنوا اشد حبا لِلّٰه (جو مومن ہوتے ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے اشد محبت ہوتی ہے) پھر اس کی تائید میں یہ حدیث شریف پیش کی ہے" لا یرمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین" (بخاری باب حب الرسول ﷺ من الایمان) یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میری ذات (یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے نزدیک اس کے والدین اور اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جائے. اَب بتائیے کیا واقعی اقبال نے محض شاعری کی ہے یا اس میں حقیقت بھی ہے"؟

مرحوم کی اقبال فہمی میں کیا کلام ہو سکتا ہے، علامہ اقبال کی حیات میں "اقبال کا تصور مومن" پر تقریر کرتے ہوئے خود ان سے داد حاصل کی تھی، پھر ان کے قوی حافظہ نے کلام اقبال کا کافی ذخیرہ محفوظ کر رکھا تھا. جس سے دوران تقریر بہت فائدہ اٹھاتے تھے، اشعار اس موزونیت کے ساتھ لاتے کہ ان سے تقریر کا اثر بڑھ جاتا اور تقریر سے ان کی صحیح ترین توجیہہ ہو جاتی!

اقبال کے بعض اشعار پر مرحوم نے مستقل تقریریں بھی کی ہیں، مثلاً چند اشعار درج ذیل ہیں:۔

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریک شورش پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دِل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

محبّت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دِل پریشان سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے

ہر کہ عشق مصطفےٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست   وغیرہ وغیرہ

اقبالؔ کے کلام کی رَوانی، اس کے زور اور بے ساختگی کا کمال انہی مقامات پر ملتا ہے جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منقبت ہوتی ہے مرحوم بہادر یار جنگ جب ایسے اشعار پڑھتے ہوتے تو عجیب کیفیت طاری ہوجاتی، خود بھی اثر میں ڈوب جاتے اور دوسروں کو بھی متاثر کر دیتے تھے، یہ چند اشعار تو مرحوم کے ورد زبان ہو چکے تھے:۔

دَر دل مومن مقام مصطفےٰ است
آبروئے ماز نام مصطفےٰ است

آشکارا دیدنش اسرائے ما
در ضمیرش مسجد اقصائے ما

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

وہ خود متشکل فکر اقبال تھے

مرحوم کی زبانی "کلام اقبال" کی اثرانگیزی کا کیا پوچھنا ہے کہ دَرحقیقت ان کی ذات میں "فکر اقبال" خود متشکل ہوگئی تھی، اقبال کی اصل شاعری کا آغاز ۱۹۰۸ء کے بعد ہوا جب وہ دیارِ غرب کا مشاہدہ اور معائنہ کر کے ہندوستان لوٹے تھے۔ البتہ مرتب صورت میں ان کی فکر پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں "اسرار خودی" کے زیر عنوان منظر عام پر آئی، مگر وہ تھی ایک فکر ہی عملی تعین کی محتاج اور اثر آفرینی کے لئے کسی تشکل کی جویاں! قدرت کی کرشمہ سامانی دیکھئے کہ ۲۶ سالہ بہادر یار جنگ بلاد اسلامیہ کی سیاحت کر کے ۱۹۳۲ء میں جب ہندوستان لوٹے ہیں تو فکر اقبالؔ ان کے سامنے اس طرح آئی گویا وہ انھیں کی متلاشی تھی۔ بہادر یار جنگ نے اس فکر کو بالکل اپنا لیا، اس کو ذہن و قلب میں بسا لیا۔ اس طرح فکر اقبال کو ایک "تشکل" مل گیا، جس کے بغیر وہ مسلم ہندوستان میں پوری طرح اثر انداز نہ ہو سکتی تھی، بہادر یار جنگ اقبالؔ کا "شاہین زادہ" اقبال کا "مرد مومن" اور اقبال کا "قلندر" بن کر ملّت کے سامنے آگئے، اور ہندوستان کے طول و عرض میں آقبال کے نقیب بنکر قوم کو اقبالی فکر حیات بخش گئے یہی اثر پاکستان کے حصول کا سبب بنا، آج وہی فکر اقبال ہے کہ اپنے "تشکل" سے محروم ہو کر پاکستانیوں کے لئے نہ کوئی جاذبیت رکھتی ہے نہ ان کو متاثر کر سکتی ہے!

اسلامی نظامِ معیشت کی کمیٹی

مرحوم کا آخری بنیادی کام "اسلامی نظام معیشت" کی تدوین تھا۔ اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی لپٹ سے سینکڑوں مسلم نوجوان مجروح ہو چکے ہیں، ان کی نظریں روس کی نظارہ بازی میں حیران ہیں —— ادھر واعظین اسلام کا یہ عالم کہ یا تو محض اشتراکیت پر لعن طعن کرتے ہیں، یا صرف اپنے مذہب کی تحسین میں حلق خشک کرتے ہیں، یہ چیز عام مسلمانوں کو تشفی ہرگز نہیں بخش سکتی، اس ضرورت کے پیش نظر مرحوم نے "اسلامی نظام معیشت" کو ایک مکمل نظام کی شکل پیش کرنے کی کوشش کی۔ اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہی سے خود اشتراکیت اور دوسرے معاشی وسیاسی نظریوں کا بغور مطالعہ اور ان کا اسلامی نظام سے مقابلہ فرما رہے تھے، لیکن یہ کام ایسا نہ تھا جو کسی ایک ہستی کی کاوشوں سے پورا ہو سکتا، پھر یہ کہ ایک جماعت کا کام زیادہ متحکم بھی ہو سکتا ہے، فرد واحد کے کام سے، ان چیزوں کے پیش نظر مرحوم نے ملک کے ماہرین کی تین مختلف کمیٹیاں بنائیں۔

۱۔ ایک کمیٹی اسلامیات کے ماہرین کی تھی جس میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اور مفتی عبدالرحیم صاحب وغیرہ تھے۔

۲۔ دوسری کمیٹی معاشیات کے ماہرین کی تھی، اس میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی اور پروفیسر عبدالقادر صاحب کے علاوہ بعض اشتراکین بھی تھے۔

۳۔ تیسری کمیٹی ان لوگوں پر مشتمل تھی جو ان دونوں کے بین بین ہوں

در دونوں سے علیحدہ علیحدہ بحث مباحثہ کر کے ان میں ربط پیدا کریں اور دونوں کی تحریروں کا تفصیلی تجزیہ کر کے یہ واضح طور پر بتلائیں کہ جدید تحریکوں میں جو عمدہ اصول ہیں وہ بدرجۂ اتم اسلام میں پائے جاتے ہیں۔ اس کمیٹی میں خود مرحوم اور ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولوی غلام دستگیر صاحب رشید وغیرہ تھے۔

اس سلسلہ میں کمیٹی کے کاروبار کے تمام اخراجات مرحوم نے اپنے ذمہ لے رکھے تھے اس کام سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرماتے تھے:۔

"اگر یہ کام میری زندگی میں تکمیل پا جائے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے ایک بڑے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی"۔

لیکن اس مقام پر قرآن مجید کا وہ ارشاد یاد آتا ہے:۔

"اَمْ لِلْاِنسانِ ما تمنّٰی" ——— کیا انسان کے لئے ہر وہ چیز ہے جس کی وہ تمنا کرے ؟ یہی ہوا، مرحوم چل بسے اور کام دھرا رہ گیا۔

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

توقع تھی کہ مرحوم کی یہ نیک تمنا پوری ہو کر رہے گی لیکن اسے کیا کیا جائے کہ غلام قوم عوام و خواص تقریباً ایک ہی سطح کے ہوتے ہیں، مرحوم کی رحلت کے بعد عوام کے جمود کے ساتھ ان خواص پر بھی خمود کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وائے ناکامی۔

بہر حال چونکہ کمیٹی کا کام تکمیل پانے کے لئے کافی عرصہ درکار تھا، مرحوم نے اپنی سحر بیانی کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال فرمایا "اسلام اور اشتراکیت" کے عنوان پر کئی پر مغز اور مدلل تقریریں کیں اور آئندہ تقاریر کے لئے بھی اس عنوان کو مختص فرما لیا تھا کہ ان حقائق نواز اور اثر آفرین تقریروں سے اشتراکیت زدہ اذہان کا علاج ہو جائیگا لیکن خدا کو منظور نہ تھا۔ محمد بہادر خاں بلا لئے گئے۔

وائے بر قسمتِ مسلمانانِ ہند

ضمیمہ

ایک بہادر مسلمان کی موت

از:- علامہ ندوی

کیا پوچھتے ہو کسے کھو دیا

از:- مولانا گیلانی

ایک بہادر مُسلمان کی موت

(از حضرت علاّمہ سیّد سلیمان ندویؒ)

چار پانچ ہفتے ہوئے میں ایک گاؤں میں تھا، کہ دفعتہً ایک صاحب نے ایک انگریزی اخبار کے حوالے سے نواب بہادر یار جنگ کی اچانک موت کی اطلاع دی، موت ہر وقت آتی ہے اور ہر وقت آسکتی ہے، تاہم جن کے مرنے کو دِل نہیں چاہتا اُن کے مرنے کی خبر کا یقین بھی دفعتہً نہیں آتا، اُن کا ہشاش بشاش متبسم چہرہ، اُن کا صحیح و تنومند جسم، اُن کا خوبصورت اور دل فریب قد بالا، ہر چیز بجلی کی کوند کی طرح سامنے آئی، اور ان کی موت کی خبر کو جھٹلا کر چلی گئی، خود جا کر اخبار پڑھا ورقوں کو اُلٹا پلٹا، روایت نے صدق کی، اور صدق نے یقین کی، اور یقین نے آنسوؤں کی صورت اختیار کی، اور انّا للّٰہ کے ساتھ دِل کی گہرائی سے مغفرت کی دعا نکلی۔

مرحوم سے جان پہچان اور بار بار کی ملاقات تو بارہ تیرہ برس سے تھی، مگر ابھی اسی سال فروری مارچ اور وسط اپریل تک حیدر آباد میں دار العلوم ندوہ کے سلسلہ سے تقریباً ان سے روزانہ ہی ملنا جلنا اور ساتھ ساتھ لوگوں کے پاس آنا جانا اور، گھنٹوں بیٹھ کر ہر موضوع پر اظہارِ خیال کا اور ہر پہلو سے اُن کے جانچنے اور پرکھنے کا موقع ہاتھ آیا، اور ہر پہلو سے محبوب ہی نظر آئے، ارادے کے پکّے، بات کے دھنی، مخلص، وفادار، خدا ترس،

عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم، مجاہد اسلام، بہادر مسلمان سپاہی، اور ہر معنی میں سپاہی، اور بہادر پٹھان اور بہادر مسلمان۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ زبان کے تیز ہاتھوں کے کمزور ہوتے ہیں، یعنی باتوں کے دھنی ہاتھوں کے سست ہوتے ہیں، مگر وہ زبان اور ہاتھ دونوں کے کے تیز تھے، اور اسی کا کرشمہ تھا کہ صرف چند سال کے اندر کشمیر کی پہاڑیوں سے لے کر دکن تک پورے ہندوستان پر چھا گئے۔

بارہ تیرہ سال گذرے ہوں گے کہ مجھے ان کا نام حیدر آباد میں پہلے پہل ایک مدراسی فاضل دوست افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کے ایک تار میں جس کو کرنول سے انھوں نے حیدر آباد میرے نام بھیجا تھا، نظر آیا، اس تار میں مجھے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ کرنول کے ایک جدید مدرسہ کے افتتاح میں بُلایا تھا۔ آنکھوں نے تار کی سطروں میں نواب بہادر یار جنگ کا نام پڑھا۔ دِل نے کہا، نواب! عیش کا پروردہ، دولت کا آفریدہ، راحت کا خوگر، محراب و منبر سے ناآشنا، وہ قومی و مذہبی مجالس کا ہیرو ہو، میرا قیام اپنے عزیز دوستوں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے گھر میں تھا، میں نے ان سے اپنی حیرت کا اظہار کیا، مولانا گیلانی نے بڑھ کر اُن کی تحسین کی، اور فرمایا جی ہاں، انھیں بچپن سے جانتا ہوں خوب بولتے ہیں، اور بڑی دل نشین تقریر کرتے ہیں، اسکول میں جب پڑھتے تھے مجھے بُلا بُلا کر اپنے جلسوں میں لے جاتے تھے، تقریر کے انعامی مقابلوں میں ہمیں انھیں تمغے اور انعام دیا کرتا تھا، آج کل میلاد کی مجلسوں میں اُن کی تقریریں بہت پسند کی جاتی ہیں، یہ وہ زمانہ تھا جب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی صدر الصدور دولت آصفیہ تھے

اور ان کے سبب سے میلاد کی محفلوں کی بڑی کثرت اور چہل پہل تھی، شستہ اور محتاط مقررین کی تلاش رہتی تھی، اس سلسلہ میں تازہ وارد نوجوان بہادر خاں کی حوصلہ افزائی پر حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔

علی گڈھ یونیورسٹی یونین سے داد پانا آسان نہیں، یونین میں اُن کی پہلی تقریر تھی، موضوع حیدرآباد میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور دعویٰ ہائے اقتدار تھا، جب تک وہ تقریر کرتے رہے، تاثیر کا دریا بہتا رہا، اور ہر شخص کو تسکین ہوگئی کہ حیدرآبادی مسلمانوں کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، ایک اچھے مقرر لیڈر کو یہ کہتے سُنا کہ انھوں نے اپنے کیس کو بہت خوبی سے پیش کیا، طالب علموں نے اُن پر تحسین و آفریں کے پھول برسائے، یہ علی گڈھ میں اُن کی پہلی جیت تھی۔

جس زمانہ میں حیدرآباد میں مسلمانوں کی پہلی شورش ہوئی، اور چند مسلمان کسی ہندو محلہ میں شہید کر دیئے گئے، مسلمانانِ حیدرآباد میں آگ سی لگ گئی تھی، اُن شہیدوں کا جنازہ لاکھوں مسلمانوں نے بڑی دھوم سے اُٹھایا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مجمع کا جوش سارے شہر میں ہندوؤں کو تہ تیغ کئے بغیر ٹھنڈا نہ ہوگا، سر اکبر حیدری کی وزارت تھی، نواب بہادر یار جنگ کو تقریر کی ممانعت تھی، دم بدم مجمع کا جوش بڑھ رہا تھا، اور خطرہ سب کے سامنے تھا، اس وقت اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہٗ کی سیاست نے اس شخص کو جان لیا جو اس بھڑکتے ہوئے شعلہ پر پانی ڈال سکتا تھا، مرحوم کہتے تھے کہ میں اپنے گھر میں تھا کہ خود اعلیٰحضرت نے مجھ سے ٹیلیفون پر ارشاد فرمایا کہ بہادر خاں، میں تم سے خواہش کرتا ہوں کہ تم اس کو فرو کرو، عرض کی، اعلیٰحضرت: یوں نہ فرمائیں بلکہ حکم دیں، فدوی ہتھیلی پر سر رکھ کر ابھی جاتا ہے، اور حکم شاہانہ بجالاتا ہے چنانچہ وہ تنہا اس مجمع میں گئے، اور چند منٹ کی مؤثر تقریر میں سارا مجمع

امن وسکون کے ساتھ منتشر ہو گیا، مسز سروجنی نائیڈو مکان کی چھت سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھیں، انھوں نے بعد کو مرحوم سے کہا کہ میں نے امن وسلامتی کی حالت میں اسٹیج کے لیڈر و مقرّر تو بہت دیکھے مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور جوش سے بھرے ہوئے مجمع کو اس طرح قابو میں لے آنے والا لیڈر اور مقرّر میں نے آج ہی دیکھا۔

اتفاق دیکھئے کہ چند ہی روز بعد مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی صدر اعظم دولت آصفیہ کے یہاں دعوت ہوئی بہت سے مہمان تھے، کھانے سے فرصت ہوئی تو ایک خوب صورت سڈول نوجوان شیروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھا اور ادب سے ہاتھ ملا کر گویا ہوا، میں خود اپنا تعارف کراتا ہوں، میں ہوں آپ کا شاگرد بہادر خاں، آنکھوں نے حیرت سے صورت دیکھی، نا آشنا پایا، تفصیل پوچھی، فرمایا آپ کی کتابوں کو پڑھ کر علم پایا، اور خطبات مدراس کو رٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا، ان کی اس تواضع سے دل شرمندہ ہوا، اور ان کی اس شرافت سے سننے والے کی گردن جھک گئی۔

ان کی یہ تواضع اور خاکساری تنہائیوں ہی میں نہیں، ہزاروں کے مجمع میں اسی طرح ظاہر ہوتی تھی، مولانا گیلانی کے ساتھ ان کی ممنونیت برملا ان کی زبان سے ظاہر ہوتی، مولانا شروانی کی حوصلہ افزائیوں کا اعتراف علی گڈھ یونین کی پہلی تقریر میں خود میرے کانوں نے سُنا۔ دار المصنفین کی کتابوں کے احسان کی کہانی اسی سال مارچ میں دار السلام حیدرآباد کے عظیم الشان جلسہ میں سب نے سُنی۔

مرحوم کی تقریریں فصاحت وبلاغت اور بدائع تینوں کے جوہر تھے۔

شاعری وہ نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی نثر شاعری کا نمونہ ہوتی تھی، اُن کی تقریریں بارہا سُنیں۔ ان کی اساس تین چیزیں ہوتی تھیں، اسلامی تاریخ کے معلومات، اقبال کے اشعار، ابوالکلام کے الفاظ، انھوں نے اقبال کو بہت پڑھا تھا، اور بہت سمجھ کر پڑھا تھا، اُن کا بیشتر کلام اُن کے حافظہ کے خزانہ میں محفوظ تھا۔ جس کو وہ اپنی تقریروں میں بہت دلنشیں انداز میں موقع موقع سے پڑھتے تھے، اور حاضرین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔

مرحوم کی تقریروں کا اصلی میدان مسلم لیگ کے اجلاس اور اتحاد المسلمین حیدرآباد کے جلسے ہوتے تھے، مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا، اُن پر دینی سیاست کا راز کھُل چکا تھا، اور وہ یہی راز سب کو بتانا چاہتے تھے، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا، اُن کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کراچی کے بعد سے لیگ کے خالص دنیاوی سیاسیوں پر ان کی تقریر بار ہونے لگی تھی۔

حیدرآباد میں اگران پچھلے چند برسوں کے اندر جب سر حیدری کی سیاست حیدرآباد کے دستور کی ترکیب وتحلیل میں مصروف تھی۔ نواب بہادر یار جنگ کا وجود نہ ہوتا تو حیدرآباد کے نظم ونسق کا کچھ اور ہی انداز ہو گیا ہوتا، بیرونی ہندو لیڈروں اور دکن کے مرہٹوں نے ریاست کی امن دوست اور وفادار غیر مسلم رعایا کو بھڑکانے میں کمی نہیں کی، اور یہ دعویٰ کیا کہ مردم شماری کے مطابق ریاست میں دونوں قوموں کے حقوق مانے جائیں، یہ سب کچھ ہو رہا تھا، مگر اس ملک کے مسلمان بالکل خواب غفلت میں تھے۔ اور بجز عیش وآرام ان کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ وہاں کے مسلمان جاگیردار جو اس ملک کی بڑی قوت ہیں۔ محو استراحت تھے۔ دکن کے مسلمانوں کی سب سے

بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ صدیوں سے حکومت کے سر پر سارا بوجھ رکھ کر آرام طلبی اور بے فکری کے عادی ہو گئے ہیں، اس بے کاری سے ان کے دست و بازو شل اور قوائے عمل معطّل ہیں، ان کا کوئی قومی تخیّل اور سیاسی جذبہ زندہ نہیں رہا ہے، اور کسی حال میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اُن کشورستانوں کی یادگار ہیں، جنھوں نے اپنے کو بڑی مشکلوں میں ڈال کر دکن کی آصفی حکومت کو قائم کیا تھا۔

مرحوم کا بڑا کارنامہ اسی جذبہ کو زندہ کرنا تھا، انھوں نے جاگیرداروں کو جھنجھوڑ کر جگایا اور بتایا کہ اگر انھوں نے اُٹھ کر اپنی زندگی اور ملک کی دینی ضرورت کا یقین نہیں دلایا تو زمانہ کا سیلاب اُن کے اقتدار کو بہا لے جائے گا، عام مسلمانوں کو یہ یاد دلایا کہ یہ ملک تمہارا مفتوحہ اور مقبوضہ ملک ہے، اور تم بحیثیت قوم کے اس کے کشورکشا اور فاتح ہو، اور خانوادۂ آصفی کا سرتاج تمہاری حکومت کا نمائندہ، تمہاری طاقت کا مظہر، تمہاری بادشاہی کا ستون، اور تمہاری وفاداری کا مرکز ہے۔

مرحوم نے اپنے سیاسی تخیل کی بناء پر تکلیفیں بھی اُٹھائیں۔ اُن پر پابندیاں بھی عائد ہوئیں، اُن کے متعلق غلط فہمیاں بھی پیدا کر دی گئیں، تاہم انھوں نے ایثار کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، یہاں تک کہ اپنے خطاب و منصب سے بھی دستبردار ہو گئے، اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

مرحوم کی کوششوں سے دکن کے مسلمانوں نے صدیوں کے آرام کے بعد کروٹ لی، اور اتحاد المسلمین کے زیر سایہ ایک مرکز پر جمع ہو گئے، اس کی شاخیں سارے ممالک محروسہ میں قائم ہو گئیں، اس کی آواز نے ملّت کی آواز کا رتبہ پایا، اس کے سالانہ اجلاس میں ایک دفعہ میں پچاس پچاس ہزار آدمی جمع ہو جاتے تھے،

مرحوم کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ کسی ملک کی سرکاری تعلیم سے قومی روح زِندہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حیدر آباد میں وہ ایک خالص قومی یا اسلامی درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے، جو دکن میں اسلامی روح پیدا کرے، اور جب تک یہ درسگاہ قائم نہ ہو ایک اسلامی بورڈنگ کی بنا ڈالی جائے جس میں شہر کے ہر اسکول و کالج کے مسلمان طلبہ اقامت پذیر ہوں، اور وہ بورڈنگ کی تعلیم و تربیت میں رہیں، چنانچہ انھوں نے پچھلے ہی سال قومی چندہ سے ایک لاکھ میں گویا حیدر آباد کے وسط میں ایک بہت بڑی عمارت خریدی، جس میں آئندہ تعمیرات کے لئے بہت بڑی وسعت ہے، یہی عمارت دارالسلام کہلاتی ہے۔ اور یہی ان کے اتحاد المسلمین کا مرکزی دفتر ہے، اسی عمارت میں ایک قومی کتب خانہ اور ایک اسلامی دارالاقامۃ اور علوم شرقیہ کی ایک چھوٹی سی درس گاہ قائم کی تھی، اس سال کے شروع میں یہ ادارے قائم ہوئے، اور اس کے ظاہر کرنے میں مجھے مسرّت ہے کہ اُن کے سیاسی و مذہبی تخیلات کی آبیاری، اور ان اداروں کی سربراہی میں جو گمنام آدمی کام کر رہا ہے، وہ تمامتر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پیداوار ہے۔ ندوہ کے لئے یہ شکر کا مقام ہے کہ دین و دنیا کی جامعیت کے ساتھ جب کہیں کوئی کام شروع ہوتا ہے تو اس کے فرزند اس کے لئے بہترین اہل ثابت ہوتے ہیں، مولوی عبدالقدوس ہاشمی آروی جو تکمیل کے بعد ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے مرحوم کی رفاقت کے لئے وہ بہترین رفیق ثابت ہوئے، اور مرحوم بھی ان کی کماحقہ قدر کرتے تھے۔ بہرحال ان اداروں کی نگرانی ان کے سُپرد کی اور انھوں نے وہیں قیام اختیار کیا۔

اس سال فروری اور مارچ اور نصف اپریل کے چند مہینے ندوہ کی

قومی امداد کے سلسلہ میں اُن کے بہت قریب گذرے، ہر دوسرے تیسرے اُن کے مکان پر جانا ہوا، جب گیا ان کو مصروف پایا، صبح سے شام تک ضرور تمندوں اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، ٹیلیفون سامنے ہوتا اور ڈاک دوسری طرف رکھی ہوتی تھی، معمولی مسلمان سے لے کر تاجر، بیوپاری، وکیل، اہل سیاست اہل مشورہ اور حکام سب ہی قسم کے اشخاص باری باری سے آتے اور باتیں کر کے واپس جاتے تھے، ملنے ملانے اور کہیں آنے جانے کے لئے کئی کئی روز پہلے وقت مقرر ہوتا اور پھر بھی اُن کا کام پورا نہیں ہوتا، میں نے حیدر آباد کے لیڈروں میں اُن سے زیادہ ہر دلعزیز کوئی آدمی نہیں دیکھا، جس کا سکّہ ہر کہہ و مہ پر یکساں چلتا تھا۔

ان کی عربی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی۔ تاہم حج کے موقع پر حجاز میں، اور حج کے بعد مصر میں کچھ روز اُن کا قیام رہا تھا، اور اس طرح عربی کی کچھ مہارت بہم پہنچائی تھی، اور چونکہ قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ برابر جاری تھا، اس لئے قرآن پاک کی آیتوں کے معنی بے تکلف سمجھ لیتے تھے، اور تفسیروں کی مدد سے قرآن پاک کے سمجھنے کی کوشش بلیغ کرتے رہتے تھے، صبح کو نماز کے بعد تقریباً نو بجے تک اپنے قریب کی مسجد میں خود ہی لوگوں کو قرآن پاک کا درس سناتے تھے۔ اور ہفتہ میں ایک دن ان کے یہاں اقبالؔ کی کتابوں کا درس ہوتا تھا، اور اقبالؔ کے فلسفہ کی گتھی سلجھائی جاتی تھی۔

مرحوم ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ نسل کے سدوزئی پٹھان تھے، اُن کے آبا و اجداد ہندوستان کے آخری مغل عہد میں جب ہر شمشیر زن قسمت آزماتا تھا۔ کچھ حوصلہ مند سپاہیوں کی جمعیت کے

ساتھ ہندوستان وارد ہوئے، پہلے ریاست جے پور میں طرح اقامت ڈالی، اور راجہ سے کچھ جاگیر پائی اور بعد ازیں حیدرآباد وارد ہوئے۔ اور جمعدار کے عہدے پر سرفراز ہوئے اور تیس ہزار کی نسلاً بعد نسلٍ جاگیر پائی۔ مرحوم نے اپنی یہ خاندانی داستان کئی بار سنائی، مگر کیا معلوم تھا یہ داستان گو اَب چند روز کا مہمان ہے۔ وَرنہ اس داستان کا حرف حرف محفوظ رکھا جاتا۔

بہادر خاں کا سا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، اور جب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب انگیز ہوتا ہے۔ اس کی ذات سے اُمّت اسلامیہ کو بڑی بڑی اُمیدیں قائم تھیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ دکن کے مسلمانوں کے حق میں اس کا وجود آبِ حیات کا حکم رکھتا تھا تاہم انسان ناچار ہے، اس کی ناچاری کا راز ایسے ہی موقع پر کھُل جاتا ہے۔ تقدیر کا نوشتہ اور قضا کا حکم ناقابل تغیّر ہے فَاِذَا جَاءَ اَجَلُھُمْ لَا یَسْتَاخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ، ۲۵ رجون ۱۹۴۴ء کو دفعتہً وہ حکم آیا۔ اور بندہ نے بِلاچون وچرا ایک لمحہ کے اندر اس کی دعوت پر لبیک کہا اور اس دنیائے دوں سے چل بسا، اس پر اللہ تعالیٰ کی صد ارحمتیں ہوں، اور بے شمار نوازشیں۔

غالباً مارچ ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ تھی، نواب دوست محمد خاں (جاگیر دار) کے یہاں دعوت تھی، جو مرحوم کے بڑے دوستوں میں تھے، احباب کا مجمع تھا، گفتگو علمی اور مذہبی تھی، مرحوم نے بڑے پُر اثر انداز میں کہا، آج قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی زبان سے جب وہ مصر سے نکل کر مدین پہنچے ہیں۔ یہ دُعاء تلاوت میں

آنی رَبِّ اِنّی لِمَا اَنزَلتَ اِلَیَّ مِن خَیرٍ فَقِیر (اے میرے پروردگار تو میرے لئے بہتری کا جو سامان بھی مہیا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں)، مرحوم نے اس مؤثر دعاء کے ایک ایک لفظ کو بڑی تاثیر کی حالت میں پڑھا۔ اور سامعین کے سامنے اس کی تشریح کی۔ خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں عرض ہے کہ اے بار الٰہا! آج جب اس دُعا کا خواستگار تیرے حضور میں ہے اور تیرے گھر مہمان، تو تو اس کے لئے وہی فرما جس کا وہ محتاج ہے۔

ماھنامۂ معارف اگست ۱۹۴۴ء

*

"کیا پوچھتے ہو کہ کسے کھودیا"

(از حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمتہ اللہ علیہ

سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ)

الحمد للہ وکفی باللہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفےٰ

نواب بہادر یار جنگ سے فقیر کی واقفیت کی ابتدا اس زمانہ سے ہوئی، جب وہ دار العلوم فوقانیہ میں میٹرک کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، یہ حیدرآباد کا ایک خاص تاریخی عہد تھا، قدیم حیدرآباد عہد عثمانی کے ہر جہتی برکات کے زیر اثر جدید حیدرآباد کا چولا آہستہ آہستہ بدل رہا تھا، یا بدلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

حیدرآباد اس وقت کیا تھا؟ اسی سے اندازہ کیجئے کہ سب سے بڑے کامیاب خطیب اس وقت کے مولوی عبدالقادر صاحب صوفی تھے، جن کے مواعظ مسئلہ وحدت الوجود پر بڑے دھوم سے تقریباً ہر جمعہ کو چوک کی مسجد میں ہوا کرتے تھے، پبلک کا عام مذاق اسی قسم کے مضامین سے دلچسپی رکھتا تھا، دوسری طرف مولود خوانی کا ایک باضابطہ نظام، حیدرآباد میں قائم تھا، جب ساری دنیا کھا پی کر سونے کے لئے اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو جاتی تھی، تب رات کے اسی ڈراؤنے سناٹے میں، شہر کے مختلف محلوں اور محلوں

کی مختلف گلیوں میں، گلیوں کے مختلف گوشوں سے انتہائی کرخت اور سمع خراش بُلند آوازوں میں آٹھ آٹھ دس دس آدمی ایک ساتھ چیختے تھے "چیخ" کے سواء کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ آخر وہ کیا پڑھ رہے ہیں — اگرچہ بظاہر حیدر آباد ان ہی حالات میں مگن تھا، لیکن حیدر آباد سے باہر جن تحریکوں کا طوفان بر پا تھا، اندر اندر دکن کے باشندوں کو بھی متاثر کر ہی رہا تھا، پہلی مرتبہ کھل کر مسلمانان دکن کو اپنے دبے دبائے جذبات کے اُبھارنے اور دکھانے کا موقعہ اس عظیم الشان جلسہ میں ملا، جسے خلافت کا جلسہ کہتے ہیں، بس اسی جلسہ سے عوامی تقریروں کا رُخ بدلنے کا آغاز ہوتا ہے، اسی کے ساتھ بتدریج راتوں والی میلاد خوانی کی جگہ میلاد کی منظم و پُر شوکت مجلسوں نے لے لی، جن میں سیرت طیبہ محمدیہ صلی اللہ علیٰ صاحبہا کے مختلف پہلوؤں پر بڑے اچھے اچھے خطیب تقریر کرنے لگے، اور سچ پوچھئے تو خلافت کی مجلس کے ختم ہونے کے بعد ان ہی میلادی مجلسوں میں وہ سب کچھ کہا جانے لگا جس کے کہنے کی ضرورت اس زمانہ میں مسلمانوں کو تھی، انہی نئے تقریر کرنے والوں میں ایک مقرر خاکسار بھی تھا۔

نواب بہادر یار جنگ "بہادر خاں" منعلم دار العلوم کے نام سے ان مجلسوں میں بالالتزام شرکت کرتے تھے، ان مجلسوں میں ان کو اکثر اپنے آگے اپنے پیچھے، دائیں بائیں پاتا تھا، جو چیز ان کی پچھلے دنوں میں ڈیل ڈول بن گئی تھی، کم عمری کے زمانہ میں اسی کی وجہ سے وہ ایک بے ڈول سے آدمی نظر آتے تھے — یہ کون ہیں، ان کو عموماً اپنے آگے پیچھے، دائیں بائیں خصوصاً تقریر و خطابت کی مجلسوں میں کیوں پاتا ہوں؟ میرا دل کبھی کبھی اس سوال کو اٹھاتا اور پھر خاموش ہو جاتا آخر ایک دن میں نے ان کو پایا کہ وہ میری

اقامت گاہ جو اس وقت جام باغ ترپ بازار میں تھی تشریف لائے "میرا نام بہادر خاں ہے، اور دارالعلوم فوقانیہ کا طالب علم ہوں آپ کی تقریروں سے دلچسپی رکھتا ہوں، اس لئے ملنے آیا ہوں"۔ اس تعارف کے بعد وہ کبھی کبھی تشریف لاتے رہے، لیکن یہ کبھی نہیں کھلے کہ حیدرآباد کے امرا، اور ارباب مناصب کے کسی خانوادہ سے ان کا تعلق ہے۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہا کہ جب تک انھوں نے اپنی زندگی کے اس پہلو سے ناواقف رکھا، اس وقت تک میرا برتاؤ ان کے ساتھ بس اس سے زیادہ نہیں تھا، جتنا کہ کالج کے کسی اُستاد کا، اسکول کے کسی طالب علم کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اب ان سے تعلقات بڑھتے چلے گئے "آپ کو دارالعلوم کے مدرسہ میں تکلیف کرنی پڑے گی" ایک دن یہ حکم لے کر تشریف لائے۔ دارالعلوم سے میرا کیا تعلق؟ میں نے عرض کیا، مرحوم نواب نے فرمایا چونکہ اس مدرسہ سے میرا تعلق ہے، آپ کے تعلق کے لئے کیا یہ کافی نہیں؟ کہنے لگے، وہاں، کی بزم میں تقریری مقابلہ ہے۔ آپ کو حکم بنا کر لے چلتا ہوں اس سے پہلے نواب مرحوم کی کسی تقریر کے سننے کا موقع نہ ملا تھا اور اس زمانے کے بھاری بھرکم بے ڈول جسم کو دیکھ کر مجھے توقع بھی نہ تھی کہ یہ کوئی اچھی تقریر کر سکیں گے، بہرحال ان کی فرمائش کی تعمیل سے گریز کی کوئی راہ نہ تھی۔ دارالعلوم حاضر ہوا۔ مقابلہ کے میدان میں مقابلے والے اُترتے رہے، میٹرک کلاس کے طلبہ جیسی تقریر کر سکتے ہیں عموماً ان میں سب کی تقریروں کا معیار بس اسی قدر تھا، آخر میں اس چوڑے جسم چکلے سینے کے ساتھ "بہادر خاں طالب علم" بھی آگے بڑھے، تقریر شروع ہوئی لیکن پہلا، دوسرا، تیسرا لفظ اِس بھاری بھرکم فربہ جسم والی زبان سے نکل کر ابھی شاید کوئی فقرہ بھی نہ بننے پایا تھا کہ اچانک توقع کی گذشتہ سطح میں ہلچل پیدا ہوئی، کان کھڑے ہو گئے، دماغ چوکنا ہو کر بیدار

ہوگیا، دِل اُٹھ بیٹھا، میں کیا سُن رہا ہوں؟ کس سے سُن رہا ہوں؟ "دکن کے مطلع سے خطابت کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے"۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی کشفی کیفیت میں یہ تماشا میرے سامنے اس وقت پیش ہو رہا ہے، اس وقت تک تو وہ کشف تھا۔ سونے کا تحفہ اپنے سحر سے مسحور کرنے والے کے گلے میں پہنایا، دُعا دی اور انتظار کرتا رہا کہ میرا کشف مشاہدہ کی شکل کب اختیار کرتا ہے، دُو برس بھی گزرنے نہ پاتے تھے کہ سکندر آباد کی میلاد کی مجلس میں نواب مرحوم بحیثیت خطیب اعظم کے شریک ہونے لگے، پھر تو غلغلہ ان کی تقریر و خطابت کا بُلند ہوا، اتنا بُلند ہوا کہ سارے ہندوستان کو اپنے اثر کے نیچے لے لیا، اس کے بعد تو وہ بڑے ہوئے، بڑے ہوتے چلے گئے، اتنے بڑے کہ مجھے ان کے ساتھ چھوٹے ہونے کی بھی نسبت باقی نہ رہی لیکن ان تمام بڑائیوں میں ایک بڑائی یہ بھی تھی کہ کسی زمانے میں چھوٹے بن کر میرے سامنے چونکہ آئے تھے اس لئے باوجود بڑے ہونے اور بڑے ہوتے چلے جانے کے خلوت کی مجلس ہو یا جلوت کی، اس کا ضرور ذِکر فرماتے تھے، اتنا کہتے کہ آج بھی اس کے تصوّر سے مجھے شرم آتی ہے لیکن جس چیز کے تصوّر سے شرم آتی ہے، برملا وہی وہ مجھے اور میرے ساتھ جو بھی اس وقت مجلس میں موجود ہوتے سب کو سُناتے چلے جاتے تھے"۔ بڑائی کے اتنے بُلند مینار پر پہنچنے کے بعد اُن دنوں کو کون یاد رکھتا ہے جن میں وہ چھوٹوں کی زِندگی گزارتا ہے! لیکن سچ یہ ہے کہ اس چھوٹے کو بڑا ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں نے بنا دیا تھا، جن کو لوگ اکثر خیال نہیں کرتے، وہی چڑھاتے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو اتارتے رہتے ہیں من تواضع للہ (فعہ اللہ) اللہ کے لئے جو جھکتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اُونچا کرتے ہیں اس راز کی راز شناسی ہر ایک کی قسمت میں نہیں۔

آخر چھوڑ چھوڑ کر جانے والوں میں کتنے ہیں جو چلے گئے اور مسلسل چلے جا رہے ہیں لیکن ان چھوڑ کر جانے والوں میں ایسا کون تھا یا ایسا کون ہے. جس کے جانے کے بعد کہنے والوں کی ایک بڑی جماعت کہہ رہی ہے، متفقہ آواز کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ ہم گونگے ہو گئے اس لئے کہ ہماری زبان ہی چپ ہو گئی اب ہم بہرے ہیں کہ جس سے خطرہ کی ہر آواز کو ہم سنتے تھے. ہمارا وہ کان ہی بند ہو گیا ہم کچھ سوچ نہیں سکتے کہ ہمارا دماغ ہی سو گیا ہم اب کیا اٹھیں گے. جب دل ہی اپنا بیٹھ گیا۔

کسی گھر یا محلے یا شہر یا تعلقہ کے باشندوں کی یہ آواز نہیں ہے، یہ ماتم ہے بہادر یار جنگ غفر اللہ لہ، کا، جو برپا ہے. مہینوں سے ہر اس مسلمان کے گھر میں جو ہندوستان میں رہتا ہے، اس ملک میں رہتا ہے جہاں کے رہنے والے طے کر رہے ہیں کہ اس ملک میں صرف ان ہی کو رہنے دیا جائے گا. جن کا یہ استھان ہے، مگر ان سے جب کہا جاتا ہے کہ پھر اسی ملک کا دوسرا استھان ہی دو جس میں ہم رہیں تو وہ اس پر راضی ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

عالم اسلام جس کے لئے رو رہا ہو، دکن رو رہا ہو، اس کا وطن رو رہا ہو، سی پی میں جس کے ماتم کی صف بچھائی گئی اور یوپی میں جس پر آنسو بہائے گئے. اُف جس کے لئے مدراس چیخ رہا ہے، بمبئی والے دھاڑیں مار رہے ہیں، بہار کے باشندے کپڑے پھاڑ رہے ہیں. سندھیوں میں جس کا نوحہ پڑھا جا رہا ہے، پنجاب میں غم کا طوفان جس کے بعد اٹھا اور کشمیر اور سرحد والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہوا۔ کیا پوچھتے ہو کہ اس کو کھو کر مجھ جیسے بے کس انسان نے کسے کھو دیا

فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

انچہ من گم کردہ ام گراز سلیمان گم شدے
ہم سلیمان، ہم پری، ہم اہرمن بگریستے

تسلّی جو کچھ بھی ہے وہ صرف اسی سے ہی کہ

غدا القی الاحبہ
محمّد ا وحزبہ

انشاءاللہ اسی حزب میں دوسروں کے ساتھ ہم اس کو بھی پالیں گے، جسے آج کھو بیٹھے ہیں۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

تمّت

*

حیاتِ بہادر یار جنگؒ

غلام محمد

بہادر یار جنگ اکادمی کراچی